مؤسس : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جنوری ۲۰۰۴

مدیر پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

خرم مراد کی کتابیں

تحریکی سفر کے لیے مشعلِ راہ
اپنی تربیت اور تزکیہ نفس کے لیے زادِ راہ



۱۲ کتابیں، قیمت: ۸۱۵ روپے

۵۶ کتابچے، قیمت: ۲۴۵ روپے

مکمل سیٹ لینے پر خصوصی رعایت کے لیے رابطہ کریں۔

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۱۳۱' عدد ۱' ذیقعد ۱۴۲۴ھ' جنوری ۲۰۰۴ء

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور- ۵۴۵۷۰

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@wol.net.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور- ۵۴۶۰۰

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زرسالانہ: ۲۰۰ روپے

تاحیات: ۳۰۰۰ روپے

(بیرونی ایڈیشن: ۳۰ روپے)

بنگلہ دیش' ایران' بھارت: ۶۰۰ روپے

یورپ' مشرق وسطیٰ' مشرق بعید' افریقہ: ۹۰۰ روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا: ۱۲۰۰ روپے

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

خسارے کی تجارت

......مگر واقعہ کیا ہے؟ یہاں جو تعلیم اور تربیت آپ کو ملتی ہے' جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے' جو خیالات' جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے ہیں' جو عادات' اطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں' اور جس طرزِ فکر' رنگِ طبیعت اور طریقِ زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں' کیا وہ سب مل جل کر اِس زمین' اِس آب و ہوا اور اِس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟......

جو تعلیم افراد کو اپنی سوسائٹی اور اس کی حقیقی زندگی سے اجنبی بنا دے اس کے حق میں اس کے سوا آپ اور کیا فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ افراد کو بناتی نہیں بلکہ ضائع کرتی ہے؟ ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر [نوشتہ] ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوحِ سادہ کی شکل میں آتا ہے' اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجاے اسے دوسروں کے حوالے کر دیتی ہے کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں' خواہ وہ ہماری اپنی موت کا فتویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

آپ غور تو کیجیے' کس قدر سخت خسارے میں ہے وہ قوم جو اپنی بہترین انسانی متاع دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے؟ ہم وہ ہیں جو انسان دے کر جوتی اور کپڑا اور روٹی حاصل کرتے ہیں۔ قدرت نے جو انسانی طاقت (man power) اور دماغی طاقت (brain power) ہم کو خود ہمارے اپنے کام کے لیے دی تھی وہ دوسروں کے کام آتی ہے...... اِن ہٹے کٹے جسموں میں جو قوت بھری ہوئی ہے' اِن بڑے بڑے سروں میں جو قابلیتیں بھری ہوئی ہیں' اِن چوڑے چکلے سینوں میں جو دل طرح طرح کی طاقتیں رکھتے ہیں' جنھیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا' اِن میں سے بمشکل ایک دو فی صدی ہمارے کام آتے ہیں' باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس خسارے کی تجارت کو ہم بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اصل سرمایۂ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے۔ اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں بلکہ سراسر ٹوٹا ہے۔

(''خطبہ تقسیمِ اسناد''، ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمان القرآن' جلد ۲۴' عدد ۱-۲' محرم و صفر ۱۳۶۳ھ' جنوری فروری ۱۹۴۴ء' ص ۶۴-۶۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایل ایف او' اداراتی استحکام اور اعتماد کا ووٹ

پروفیسر خورشید احمد

اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں (دسمبر میں) جو پارلیمنٹ وجود میں آئی تھی' اس نے اپنا پہلا سال جوں توں کر کے مکمل کرلیا ہے۔ جنرل پرویز مشرف اور ظفراللہ جمالی کے نام نہاد اشتراک اقتدار پر مبنی حکومت کے پہلے سال کو جنرل صاحب کے تین سالہ بلاشرکت غیرے اقتدار کا تسلسل ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپوزیشن اور خصوصیت سے متحدہ مجلس عمل کی ساری کوشش اور کاوش کے باوجود جنرل پرویز مشرف کی ہٹ دھرمی' جمالی حکومت کی کمزوری اور علاقے کے بارے میں امریکی پالیسی کے باعث پارلیمنٹ اپنی بالادستی قائم نہ کرسکی۔ اس طرح پورا سال ایک ایسی کش مکش کی نذر ہوگیا جس کے نتیجے میں جمہوری سفر صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوسکا۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

اس صورت حال سے ملک کی فوجی اور سیاسی قیادت کی معاملہ فہمی کی جو تصویر قوم کے سامنے آتی ہے وہ اپنے اندر تشویش کے بے شمار پہلو رکھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور اللہ تعالیٰ جو بھی مواقع قوم کو دے رہا ہے' اس کی قیادت ان کو ضائع کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب عالمی طاقتیں پوری مسلم دنیا پر شدید یورش کررہی ہیں اور ہماری آزادی' حاکمیت' دینی تشخص اور ملّی وقار سب اس کی زد میں ہیں' ہماری قیادت خطرناک حد تک عاقبت نااندیشی کی روش پر گامزن ہے بلکہ اس مہلک راستے پر چلنے پر مصر ہے۔

سالِ گذشتہ (۲۰۰۳ء) کے آخری مہینے کے وسط میں (۱۷ دسمبر کے آس پاس) تین واقعات ایسے ظہور پذیر ہوئے ہیں جن پر سنجیدگی سے غوروفکر کی ضرورت ہے۔ اگر بصیرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو بظاہر آزاد اور مستقل بالذات (self-contained) ہونے کے باوجود ان واقعات میں واضح طور پر باہمی ربط و تعلّق نظر آتا ہے۔

پہلا واقعہ ۱۸ دسمبر سے شروع ہونے والی مجلسِ عمل کی عوامی تحریک ہے جو اگرچہ ایل ایف او کے بارے میں حکومت کے مسلسل لیت و لعل اور سردمہری کے نتیجے میں رونما ہوئی ہے لیکن دراصل اب وہ پاکستان اور اُمت مسلمہ کو جو خطرات اس وقت درپیش ہیں اور جن کے بارے میں حکومتِ وقت تجاہل اور تغافل ہی کی مجرم نہیں بلکہ عملاً ان کو اور بھی گمبھیر کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے' ان کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو بیدار اور منظم کرنے کا عنوان بن گئی ہے۔ تحریک کے شروع ہوجانے کے بعد حکومت نے ایل ایف او کی حد تک مجلسِ عمل سے طے شدہ معاملات کو پارلیمنٹ میں دستوری ترمیمی بل کی شکل میں لانے کے لیے کچھ سرگرمی دکھائی ہے (ان سطور کے ضبطِ تحریر میں لاتے وقت تک کچھ پیش رفت کے آثار نظر آرہے ہیں گو بعد از خرابیِ بسیار)۔ لیکن ایم ایم اے نے افہام و تفہیم اور معاملہ فہمی کی اعلیٰ صفات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دستوری تنازعے کا حل نکالنے کے لیے ایک بار پھر دستِ تعاون بڑھایا ہے مگر اس واضح اعلان کے ساتھ کہ دستوری گتھی کو سلجھانے میں تعاون کو کسی صورت میں بھی اقتدار میں اشتراک یا جنرل پرویز مشرف پر کسی درجے میں بھی اعتماد کے اظہار سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا اور اس کی بنیادی وجہ جنرل صاحب کی خارجہ' داخلہ' ثقافتی اور نظریاتی پالیسیوں سے مجلس کا شدید اختلاف ہے۔ ملک کی تعمیرِ نو کے لیے مجلس اپنے ایجنڈے پر کسی سمجھوتے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔

مجلسِ عمل نے ایک طرف پوری بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دستوری تنازعے کے حل کی ایک اور کوشش پر آمادگی کا اظہار کیا ہے (اور ہماری دعا ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہو اور ماضی کی کوششوں کی طرح درمیان میں تعطل کی نذر نہ ہوجائے) تو دوسری طرف پاکستان اور اُمت مسلمہ کو درپیش معاملات کے سلسلے میں اسے جنرل صاحب کی پالیسیوں سے جو اصولی اور جوہری اختلاف ہے' اس پر پوری استقامت دکھا کر تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعانوا علی الاثم

والعدوان (نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو مگر گناہ اور زیادتی و بے انصافی کے باب میں ہرگز تعاون نہ کرو) کے قرآنی اصول کے مطابق اپنی پالیسی پر ثابت قدم رہنے کی اعلیٰ مثال قائم کی گئی ہے۔

ہم اس امر کا بار بار اظہار کر چکے ہیں کہ ایل ایف او کا مسئلہ محض کوئی نظری مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس پر پورے نظام کے جواز (legitimacy) کا انحصار ہے اور اس کے ساتھ ہی ملک کے مستقبل کے جمہوری نظام کے ارتقا کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ ایل ایف او کے تحت انتخابات میں شرکت ایک ناگزیر برائی اور ایک وقتی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر جمہوری عمل شروع نہیں ہوسکتا تھا اور پارلیمنٹ اپنا کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں آسکتی تھی۔ لیکن ایک بار جب پارلیمنٹ وجود میں آگئی اور سول حکمرانی کے دور کا آغاز ہوگیا تو اولین اہمیت اس چیز کو حاصل تھی کہ دستوری اور جمہوری مسلمات کے سلسلے میں ایل ایف او کے بنیادی انحرافات' کی تصحیح کر دی جائے اور وہ یہ ہیں:

۱- دستوری ترمیم کا حق کسی ایک فرد کو حاصل نہیں ہے اور نہ سپریم کورٹ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خود دستوری ترمیم کرے یا کسی کو کرنے کا اختیار دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام دستوری ترامیم منتخب پارلیمنٹ کے سامنے لائی جائیں اور وہ ان میں سے جن کو مناسب سمجھے قبول کرے اور جن کو ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف سمجھے انھیں رد کر دے۔

۲- جمہوریت کا سب سے بنیادی اصول عوامی نمایندوں کا یہ اختیار ہے کہ وہ دستور کی حفاظت کریں۔ دستور کے مطابق حکومت سازی کا فریضہ انجام دیں' قانون سازی اور پالیسی سازی کا منبع عوام کا منتخب ایوان ہو اور حکومت اور اس کے سارے کارپرداز (سول ہوں یا فوجی) اس کے سامنے جواب دہ ہوں اور اس کی طے کردہ پالیسی پر گامزن!

۳- دستور' پارلیمنٹ اور منتخب نمایندوں پر کسی فرد یا گروہ کو بالادستی حاصل نہ ہو اور جس طرح سول انتظامیہ اور باقی تمام ادارے دستور کے مطابق سول حکومت کے

ماتحت ہوتے ہیں، اسی طرح فوج بھی سول حکومت کے ماتحت ہو۔

۴- ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی، پارلیمانی اور وفاقی نظام کا جو نقشہ قوم کے مکمل اتفاق سے وضع کیا گیا ہے اسے بحال کیا جائے اور پوری دیانت سے اس پر عمل کیا جائے۔ اگر یہ مقصد ایک جست میں حاصل نہ ہو تب بھی اقساط میں اور تدریج کے ساتھ اس ہدف کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

بنیادی طور پر یہی چار چیزیں ہیں جن کے تحفظ کے لیے ایل ایف او کے اوپر سارے مذاکرات ہوئے اور اس کی ۲۹ دفعات میں سے ۲۲ کو مصلحتاً قبول کر کے باقی سات میں ایسی ترامیم کرانے کی کوششیں کی گئیں جو دستور کو ان چاروں اصولوں سے کم سے کم حد تک ہم آہنگ کر سکیں۔ بلاشبہہ جو معاہدہ مجلسِ عمل اور حکومت کے درمیان ہوا ہے وہ معیاری نہیں، صرف گوارا حد تک قابلِ قبول ہے لیکن یہ حکمت کا تقاضا تھا کہ سیاسی تعطل سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ بنایا جائے اور کم از کم حد تک جمہوری عمل کو شروع کر دیا جائے تاکہ رخ تبدیل ہو اور آیندہ زیادہ سیاسی قوت حاصل کر کے دستوری نظام اور سیاسی پالیسیوں کو مزید جمہوری بنایا جائے۔ گاڑی کو پٹڑی پر لانا پہلی ضرورت ہے۔ پھر اس کو اچھی رفتار سے چلانے اور منزل تک پہنچنے کے بہترین طریقوں پر گامزن کرنے کی سعی و جہد ہو سکتی ہے۔

یہی وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر مجلسِ عمل نے کم سے کم قابلِ قبول پیکج کو قبول کرنے اور ملک کو موجودہ بحران سے نکالنے کی حکمت عملی اختیار کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ہمیں جنرل پرویز مشرف اور جمالی حکومت کی بیشتر پالیسیوں سے شدید اختلاف ہے اور ہم ان کو اعتماد کا ووٹ کسی قیمت پر نہیں دے سکتے۔ ہم حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتے ہوئے ان پالیسیوں کو تبدیل کرانے کی جمہوری اور عوامی جدوجہد جاری رکھیں گے اور حکومت کا حصہ نہیں بنیں گے۔

یہ حکمت کی شاہراہِ وسط ہے اور ہماری دعا ہے کہ حکومت اس اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے لیے اب کوئی اور چال نہ چلے اور جلد از جلد پارلیمنٹ میں دستوری ترامیم کا بل لا کر نئے سال کا آغاز ایک بہتر جمہوری فضا کو ہموار کرنے سے کرے۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار

کر رہے ہیں اور ایک خاص لابی کی طرف سے ''بی ٹیم'' اور ''ملا-ملٹری اتحاد'' کی سطحی پھبتیوں سے آمریت سے جمہوریت کی طرف لوٹنے کی راہ کھوٹی نہیں کی جاسکتی۔ البتہ دو باتیں بہت صاف ہیں اور ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔

اولاً: ہم نے یہ دستوری پیکج وقت کی نزاکت اور ضرورت کے مطابق قبول کیا ہے اور اسے کم سے کم آخری حد (bottom line) کے طور پر اختیار کیا ہے۔ یہ ہماری حکمت عملی کا پہلا قدم ہے۔ جیسے جیسے ہمیں مزید عوامی تائید حاصل ہوگی اور دوسری سیاسی قوتوں کا تعاون ملے گا ہم مزید دستوری ترامیم کے ذریعے اپنے تصور کے مطابق اصلاحات کرنے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے اور دستور کو ۱۹۷۳ء کے اصل دستور کی دفعات اور روح کے مطابق ایک حقیقی اسلامی پارلیمانی اور وفاقی دستور بنانے اور اس میں مزید بہتری لانے کی کوشش جاری رکھیں گے، نیز جہاں جہاں اور جس حد تک اس سے انحراف ہوا ہے اس کی تصحیح کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ موجودہ حالات میں دستوری اصلاح کا عمل ایک ہی ہلّے میں مکمل نہیں ہوسکتا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ خارجہ اور داخلہ میدانوں میں جو غلط پالیسیاں جنرل صاحب نے اختیار کی ہیں اور جن کی طوعاً وکرہاً جمالی حکومت تائید کر رہی ہے، ان پر گرفت کرنے اور انھیں تبدیل کرنے کے لیے پارلیمانی اور عوامی جدوجہد ہم جاری رکھیں گے اور جہاں جتنی قوت ہمیں حاصل ہے اس کو ہر غلطی کی اصلاح کے لیے استعمال کریں گے۔ ہم عوامی قوت کو اس طرح منظم و موثر بنانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی اور جمہوری شناخت مضبوط تر ہو، ملک پر امریکی سامراجی اقتدار کی گرفت سے نجات حاصل کی جائے اور اپنی آزادی، حاکمیت، معاشی خودانحصاری، دفاعی صلاحیت اور نظریاتی اور تہذیبی تشخص کی مکمل حفاظت ہو، قومی کشمیر پالیسی اور ملت اسلامیہ سے ہماری وفاداری اور اس کے تمام مسائل کے بارے میں پوری یکسوئی کے ساتھ حق وانصاف کی مکمل پاس داری کرتے ہوئے ہم اپنا مثبت کردار ادا کرسکیں۔ دنیا کے تمام ممالک سے، بھارت سمیت، ہم دوستی کے قائل ہیں مگر یہ دوستی عزت اور حق وانصاف کی بنیادوں پر ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ تاریخ کا یہی فیصلہ ہے کہ قوموں اور گروہوں کے درمیان دوستی اور تعاون اسی وقت پایدار ہوسکتے ہیں، جب وہ ہر قسم کے جبر، دباؤ اور ناانصافی سے پاک ہوں۔ مجلسِ عمل اور تمام دینی اور

جمہوری قوتیں ان شاء اللہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی۔ ہماری جدوجہد کسی تصادم کے لیے نہیں ہے بلکہ ان مقاصد کے لیے عوام کو بیدار کرنے، ان کو منظم کرنے اور تمام دینی اور جمہوری قوتوں کو ملک وقوم کی آزادی اور اس کے اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے مسلسل سرگرم عمل رکھنے کے لیے ہے۔ یہ کام ہمیں حکمت اور استقامت کے ساتھ اور پورے تسلسل سے انجام دینا ہے۔ یہ کوئی وقتی کام نہیں بلکہ ایک مستقل ذمہ داری ہے جو جہدِ مسلسل ہی سے پوری کی جاسکتی ہے۔

اس مہینے کا دوسرا اہم واقعہ راولپنڈی کے حساس علاقے میں لئی نالہ پُل کو پانچ بموں سے اڑانے سے متعلّق ہے جس کا بظاہر ہدف جنرل پرویز مشرف کا قافلہ تھا۔ اس واقعے کی مذمت ہم نے بروقت کی اور تمام دینی اور سیاسی قوتوں نے اسے ایک مجرمانہ اور ناقابلِ معافی فعل قرار دیا ہے۔ ہم تشدد کی سیاست کے ہمیشہ سے مخالف ہیں اور اسے صحت مند معاشرے کے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہم آج نہیں کہہ رہے بلکہ تحریکِ اسلامی کا پہلے دن سے یہ موقف ہے کہ تبدیلی کا صحیح طریقہ دعوتی، جمہوری اور دستوری طریقہ ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے دستور میں بڑے واشگاف الفاظ میں یہ کہا ہے، ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے اور سب کو اس کی دعوت دی ہے:

> جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی، یعنی تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عامہ کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیشِ نظر ہیں۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔ (دفعہ ۵)

نیز قائدِ تحریک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے دنیا کی تمام اسلامی تحریکات کو مخاطب کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تلقین کی کہ اسلامی انقلاب کی راہ سازش اور تخریبی حربوں سے ہموار نہیں کی

جاسکتی۔ ان کا ارشاد ہے:

اس سلسلے میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انھیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے، بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے، اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا، وہ ایسا پایدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جاسکے گا۔ (''دنیاے اسلام میں اسلامی تحریکات کے لیے طریق کار''، تفہیمات، جلد سوم، ص ۳۶۲-۳۶۳)

مولانا مودودیؒ نے جنرل محمد ایوب کو بھی متنبہ کیا تھا کہ انھوں نے فوجی انقلاب کا راستہ اختیار کر کے قوم کو بہت غلط راستے پر ڈالا ہے۔ اسی طرح عالمِ اسلامی میں فوج کے سیاسی کردار پر انتباہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ ''یاد رکھیے جو تبدیلی بندوق کی نالی سے آتی ہے وہ بندوق کی نالی ہی سے تبدیلی کا خطرہ مول لیتی ہے''۔ اس اصولی پوزیشن کی روشنی میں راولپنڈی کے واقعے کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ان میں سے چند پر ٹھنڈے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ غور و فکر قوم کے تمام عناصر کے لیے بشمول اس ملک کی فوجی قیادت ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم میں اصل استحکام اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اس میں اولاً مکمل طور پر دستور اور قانون کی حکمرانی ہو، اور ثانیاً افراد کے مقابلے میں اداروں کے استحکام کی فکر کی جائے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت جو بات سیدنا

ابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہی تھی وہ تاریخ کا روشن ترین سبق ہے۔ اُمت غم واندوہ میں نڈھال تھی اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی تک نے یہ کہہ دیا تھا کہ جو کہے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں' اس کا سر قلم کر دوں گا' لیکن دین حق اور مزاجِ نبوت کے شناسا حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کی آیات تلاوت کر کے یاد دلایا کہ کوئی انسان ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ حی و قیوم صرف اللہ کی ذات ہے اور جس نے اللہ کے دین کو تھاما وہ استحکام کی راہ پر گامزن ہوا۔ یہی بات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ علیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین ' یعنی مسلمانوں کے لیے صحیح راستہ اللہ کے رسول اور اس کے راشد خلفا کی سنت کی پیروی ہے۔ گویا اللہ کا رسول اللہ کو پیارا ہوا لیکن اس کی سنت اور اس کے راستے پر چلنے والوں کی سنت ابدی ہے اور استحکام اور تسلسل کی ضامن۔

لہٰذا استحکام قانون کی حکمرانی اور اداروں کے دوام سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ خیر ہے جسے دنیا نے بھی تجربات سے سیکھا ہے۔ قومی معاملات میں استحکام اداروں کے مستحکم ہونے سے آتا ہے اور جہاں کسی نظام کا انحصار محض افراد پر ہو وہ بہت ہی بودا اور کمزور ہے۔ فرانس کے اس وزیراعظم کا مشہور واقعہ ہے جس کی قیادت میں فرانس نے جنگ عظیم اول میں کامیابی حاصل کی تھی کہ کوئی انسان ناگزیر نہیں۔ جب کسی نے کہا: جناب وزیراعظم! آپ فرانس کے اقبال کے لیے ناگزیر ہیں' تو اس نے یہ تاریخی جملہ کہا کہ ''قبرستان ناگزیر انسانوں سے بھرا پڑا ہے''۔ اور جب دوسری جنگ کے دوران ونسٹن چرچل سے پوچھا گیا کہ فتح کے بارے میں تمھارے اعتماد کی بنیاد کیا ہے تو اس نے کہا کہ اگر انگلستان کی عدالتیں انصاف کر رہی ہیں تو انگلستان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

ہمارا اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہم نے اداروں کے استحکام کو نظرانداز کیا ہے اور ہر مدعی نے یہی ڈھونگ رچایا ہے کہ ملک کی سالمیت اور ترقی کا انحصار میری ذات پر ہے' میں ہی عقل کل اور ہر دستور اور قانون سے بالا ہوں۔ ملک غلام محمد نے بھی یہی کھیل کھیلا اور دستور ساز اسمبلی اور قانون کی حکمرانی کا تیاپانچہ کر ڈالا۔ جنرل ایوب خان نے بھی یہی کیا اور جب ان پر دل کا دورہ پڑا تو ٹی وی پر آ کر چل پھر کر انھیں دکھانا پڑا کہ وہ زندہ ہیں۔ ایوب کا اپنا بنایا ہوا دستور ان کی

زندگی میں ہی ان کا ساتھ نہ دے سکا اور خود انھوں نے قومی اسمبلی کے اسپیکر کی جگہ مسلح افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل یحییٰ خاں (مارچ ۱۹۶۹ء) کو اقتدار سونپ دیا۔ ایوب ہوں یا یحییٰ، ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا نواز شریف، جنرل ضیاالحق ہوں یا جنرل پرویز مشرف، سب اس مغالطے کا شکار اور اداروں کی کمزوری، تباہی اور عدمِ استحکام کے مجرم ہیں۔ اس واقعے کا اصل سبق یہ ہے کہ دستور، قانون اور اداروں کی فکر کی جائے اور انھیں مستحکم کیا جائے۔

دوسری بات سوچنے کی یہ ہے کہ کسی سطح پر بھی سیاست میں قوت اور گولی کے استعمال کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ جس طرح سے یہ چیز افراد اور گروہوں کے لیے غلط ہے اسی طرح یہ ان لوگوں کے لیے بھی غلط ہے جن کو قوم اور ملک کی حفاظت اور اس کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ہمیں بحیثیت قوم اور قوم کے تمام عناصر کو بشمول فوج اور پولیس اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہر ایک اپنے اپنے دستوری دائرے میں رہ کر اپنا کردار ادا کرے۔ ''قانونِ ضرورت'' کے نام پر جس سیاسی دہشت گردی اور فوجی مداخلت کا دروازہ ہماری عدالتوں نے کھول دیا ہے، اب اسے ہمیشہ کے لیے بند ہو جانا چاہیے۔ سطحی انداز میں ایک دہشت گردی کی مذمت اور آئینی دہشت گردی کے دوسرے تمام اسالیب سے اغماض حالات کو سدھارنے کا راستہ نہیں۔ ہم پوری دیانت اور دردمندی سے دہشت گردی کے ہر راستے کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس پر قوم کا اجماع ہو۔ سب کے لیے ضروری ہے کہ خلوصِ دل سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں اور ان حدود کی پاسداری کا عہد کریں جو اداروں کے استحکام، دستوری نظام کی پرورش اور ترقی، قانون کی بالادستی اور حقوق کی مکمل پاسداری کی راہ ہموار کرسکے۔

اس افسوس ناک واقعے پر جنرل صاحب کے ممدوح ملک امریکہ کے ایک روزنامے واشنگٹن ٹائمز نے جو اداریہ لکھا ہے، اس کے کچھ حصے اس لائق ہیں کہ جنرل صاحب خود اور ان کے وہ ساتھی جو ہر روز جنرل صاحب کے ہاتھ مضبوط کرنے کے راگ الاپتے ہیں (اور درحقیقت وہ اداروں کو کمزور کرنے کی پالیسی پر عامل ہیں) ذرا غور سے پڑھیں:

قاتلانہ حملے کے واقعات عجیب اور حیرت انگیز ہیں۔ جس نے بھی بم نصب کیے اس نے بڑے حیرت انگیز طور پر کیا ہوگا اس لیے کہ ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ پونڈ تک کے بم خفیہ

طور پر اتارے اور نصب نہیں کیے جاسکتے۔ خاص طور پر اس لیے کہ یہ بم فوج کی دسویں کور کے ہیڈکوارٹر سے آدھے میل کے فاصلے پر اور ملک کے محفوظ ترین علاقے میں واقع پُل پر نصب کیے گئے تھے۔ امکانات یہ ہوسکتے ہیں کہ مشرف کے اندرونی حلقے میں سے کوئی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے' یا اس کو ڈرامائی انداز سے تنبیہ کر رہا ہے۔ غیر یقینی تفصیلات سے قطع نظر' قاتلانہ حملہ اس ضرورت کو واضح کرتا ہے کہ پاکستان کو اپنے موجودہ صدر کے بغیر' مستقبل کے لیے جمہوریت کو اندرونی طور پر مضبوط کرنے کی تیاری کرنا چاہیے۔ پاکستان میں کیا ہوتا اگر اس بم نے مشرف کو قتل کر دیا ہوتا؟ اس کے بارے میں اندازے لگائے جاسکتے ہیں۔ مگر اب اس پر سوچنا چاہیے۔ صدارتی قتل کے نتیجے میں سینیٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو اور وائس چیف آف آرمی اسٹاف جنرل یوسف اقتدار سنبھالیں گے۔ دونوں سیاسی طور پر کمزور شخصیات ہیں اور ان کی قیادت عدمِ استحکام اور غیر یقینی صورت حال --- ایک فوجی انقلاب تک لے جائے گی۔ (اداریہ واشنگٹن ٹائمز' مشرف پر حملہ' ۱۸ دسمبر ۲۰۰۳ء)

بات صرف واشنگٹن ٹائمز ہی کی نہیں۔ جب خود جنرل صاحب سے ۱۸ دسمبر والے انٹرویو میں رائٹر کے نمایندے نے اس مسئلے سے ان کا سامنا کرایا تو جنرل صاحب کا جواب شنید اور ان کے چہرے کی کیفیات دیدنی تھیں۔ ڈان اخبار کی رپورٹ ملاحظہ ہو:

بہت سے غیر ملکی سرمایہ کاروں اور مغربی سفارت کاروں کو اندیشہ ہے کہ اگر جنرل مشرف جانشینی کے کسی واضح نظام کے بغیر مر گئے تو پاکستان عدمِ استحکام اور انتشار کا شکار ہوجائے گا۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ نظام اور اداروں کو ابھی قائم ہونا ہے۔ جب اصرار کیا گیا کہ جانشینی کا نظام کیسے چلے گا؟ تو جنرل مشرف نے غیر یقینی کا اظہار کیا: ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کسی دوسرے جنرل کا مسئلہ ہے۔ میرے خیال سے یہ نظام کی بات ہے۔ ارے! میں نے تو اس پر درحقیقت سوچا ہی نہیں''۔ پوچھا گیا کہ اتوار کے واقعے میں بال بال بچ جانے کے بعد' اس ممکنہ واقعے کے بارے میں اب سوچنا چاہیے

تو انھوں نے اتفاق کیا: ''ہاں' یہ کرنا چاہیے''۔ (رائٹر' ڈان' ۱۹ دسمبر ۲۰۰۳ء)

ہم جنرل صاحب کے قافلے پر حملے کی ایک بار پھر مذمت کرتے ہیں اور اس رجحان کو قوم اور ملک کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم اُتنا ہی ضروری اس امر کا اظہار بھی سمجھتے ہیں کہ ملک کی سب سے بڑی ضرورت اداروں کا استحکام' دستور کا احترام' قانون کی بالادستی اور انصاف پر مبنی امن اور احترامِ باہمی ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی راستہ اختیار کیا جائے گا وہ تباہی کا راستہ ہے اور اس سے ملک اور قوم کو بچانا اس کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے۔ واشنگٹن ٹائمز اور خود رائٹر کے نمایندوں نے جو سوال اٹھائے ہیں اور جنرل صاحب نے جو جواب دیے ہیں' کیا یہی وہ مستحکم جمہوریت (sustainable democracy) ہے جس کے عطا کرنے کا دعویٰ جنرل صاحب نے کیا ہے؟

اس مہینے کا تیسرا اہم واقعہ کشمیر پر جنرل پرویز مشرف کا افسوس ناک ہی نہیں شرم ناک یوٹرن (U-turn) ہے۔ ۱۸ دسمبر کو رائٹر کو دیے جانے والے انٹرویو ہی میں انھوں نے ۵۶ سالہ قومی پالیسی کو دریابرد کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کی قراردوں کو ایک طرف رکھ کر استصواب کے متبادل سرابوں کی بات کی ہے اور اسے ''لچک'' اور ''میانہ روی'' سے تعبیر کیا ہے' اور اس خطرے کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ اگر بھارت ان کی اس half-way پسپائی کا خیر مقدم نہیں کرتا تو پاکستان میں انتہاپسندوں کو اُبھرنے کا موقع مل جائے گا۔

جنرل صاحب کے الفاظ ان کے ذہن اور منصوبوں کو سمجھنے کے لیے سامنے رکھنا ضروری ہیں:

> ہم اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کے حق میں ہیں لیکن اب ہم نے ان کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔ ہر چیز' خود عسکریت پسندی میں کمی بنیادی طور پر مکالمے کے عمل کی طرف آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہ سیاسی مکالمہ واقع نہیں ہوتا' تو کون جیتے گا اور کون ہارے گا؟ یہ اعتدال پسند ہیں جو ہاریں گے اور انتہاپسند ہیں جو جیتیں گے اور

ٹھیک یہی دراصل واقع ہو رہا ہے۔

جنرل صاحب نے اتنے کھل کر یہ بات پہلی بار کہی ہے لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے اور اس کے بعد امریکہ کی گرفت میں جکڑے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اس مقام کی طرف پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔ انھوں نے لچک کی بات بار بار کی۔ پھر وہ چار نکاتی فارمولے کا راگ الاپتے رہے جس میں سیاست خارجہ کا ایک مضحکہ خیز اصول انھوں نے وضع کیا کہ ہر وہ حل ترک کر دیا جائے جو کسی بھی فریق کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ اس کا نتیجہ بند گلی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ پھر انھوں نے جنگِ آزادی اور حق خوداختیاری کے لیے جدوجہد اور دہشت گردی کے فرق کو عملاً نظرانداز کرنا شروع کر دیا' حتیٰ کہ بھارت کی نام نہاد سرحد پار دہشت گردی کے الفاظ تک کی بازگشت خود ان کے 'بیانوں میں سنائی دینے لگی۔ پھر اعتماد قائم کرنے والے اقدامات (CBMs) کے گن گائے جانے لگے۔

اس کے بعد وہ قلابازی لگائی گئی جو بھارت کی ۵۶ سالہ سرحدی خلاف ورزیوں کا خود بھارت کے لیے ایک انعام تھی' یعنی خلاف ورزیوں کا نشانہ بننے والوں کی طرف سے سیزفائر اور اسے سیاچن تک پھیلا دینا! اس کے بعد ایک ہی اور بم ہو سکتا تھا اور وہ جنرل صاحب نے خود ہی ۱۸ دسمبر کو ۱۹۷۱ء کے ۱۶ دسمبر کا ماتم کرنے والی قوم پر داغ دیا۔ بھارت برابر اعلان کر رہا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی قرردادیں بے کار اور غیر متعلق ہو چکی ہیں۔ اس بارے میں جنرل صاحب نے یہ کہہ کر کہ ہم اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہوتے ہیں ایسے صدمے سے دوچار کیا ہے قوم سکتے کے عالم میں ہے۔ جمالی صاحب کہہ رہے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادیں ہی کشمیر کے مسئلے کا حل ہو سکتی ہیں۔ وزیرخارجہ معذرتیں کر رہے ہیں کہ جنرل صاحب کا مفہوم یہ نہیں' وزیراطلاعات اپنے ردے چڑھانے کی مشق فرما رہے ہیں۔ وزارتِ خارجہ کا ترجمان سر کھجلا رہا ہے' مگر جنرل صاحب نے وہ اعلان کر ڈالا جس سے بھارت کی قیادت کی باچھیں کھل گئیں اور ان کے ایوانوں میں گھی کے چراغ جلائے گئے اور امریکہ اُچھل پڑا کہ بالآخر پاکستان نے ریفرنڈم سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

بات بہت واضح ہے اور وزیرخارجہ' وزیراطلاعات اور دفتر خارجہ کی یاوہ گوئیاں اس پر

پردہ نہیں ڈال سکیں۔ امریکہ اور بھارت نے اپنا مقصد بظاہر حاصل کرلیا ہے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان رچرڈ بوشر (Richard Boucher) کے الفاظ قابلِ غور ہیں:

> امریکہ صدر مشرف کی تجویز کا خیرمقدم کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی حیثیت متعین کرنے کے لیے ریفرنڈم کے مطالبے کو ترک کرنا ایک تعمیری قدم ہے۔

اس پر بھارت کا ردعمل بھی قابلِ غور اور ہماری قیادت کے لیے مقامِ عبرت ہے۔ جنرل صاحب کے اعلانِ پسپائی پر نہ صدرِ مملکت گویا ہوئے اور نہ بھارتی وزیراعظم۔ کابینہ کی سلامتی کی کمیٹی نے باقاعدہ اس پر غور کیا (ہمارے وزیراعظم کو تو بیان کا علم بھی نہ تھا) اور وزیرخارجہ یشونت سنہا نے کہا:

> اگر کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف میں تبدیلی آ گئی ہے یا اس میں کوئی اصلاح اور ترمیم کی گئی ہے تو بھارت اس کا خیرمقدم کرے گا۔ سخت گیر موقف پاکستان نے اختیار کر رکھا تھا اور وہ مذاکرات میں کشمیر کو مرکزی حیثیت دینے پر اصرار کرتا تھا، جب کہ ہم نے ہمیشہ لچک کا مظاہرہ کیا۔

اور پھر اس لچک کی ایک جھلک کشمیر کے اخبار کشمیر ایج کو انٹرویو دیتے ہوئے یشونت سہنا نے دکھائی:

> پاکستان کشمیر میں عسکریت پسندی کی حمایت ترک کر دے کیونکہ کشمیر میں انسانی حقوق کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہو رہی۔ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے جس سے ہم کسی صورت دستبردار نہیں ہو سکتے۔

ستم ظریفی ہے کہ پاکستان کے کمانڈو صدر جنرل پرویز مشرف کے اس اعلان کے صرف پانچ دن پہلے نئی دہلی میں امریکہ کی سابق وزیرخارجہ میڈلین آل برائٹ نے تو بھارتی قیادت کی موجودگی میں اور پاکستان کی ایک سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے مصالحتی بیانات پر ٹھنڈا پانی انڈیلتے ہوئے کہا تھا:

> میرا خیال ہے کہ استصواب یا ریفرنڈم ہی کشمیری عوام کی مرضی معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔

لیکن اپنے ہی جرنیل صاحب نے جو کارگل کے ہیرو بھی سمجھے جاتے ہیں، استصواب رائے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسے لچک، آدھا رستہ طے کرنا اور اعتدال کا رویہ قرار دیا ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے --- گویا اب ہر پسپائی بہادری اور جرأت مندی ہے۔ اصولوں سے ہر انحراف کا نام اعتدال اور ماڈریشن ہے، حق پر اصرار انتہا پسندی ہے اور آزادی اور خودمختاری کی بات تشدد اور دہشت گردی کے مترادف ہے ع

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!

جنرل صاحب کا یہ اعلان درحقیقت اس بگاڑ کا ایک مظہر ہے جو شخصِ واحد کی حکمرانی اور ایل ایف او کے نام پر انھیں مختارِکل بنا دینے کا نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص پورے نظام کا کرتا دھرتا بن جائے اور ہر جواب دہی اور احتساب سے بالا ہو، نہ اسے کابینہ کی ضرورت کا احساس ہو اور نہ اس کی رائے کا خیال ہو اور نہ پارلیمنٹ کی ہم نوائی اور تائید اس کے لیے کوئی اہمیت رکھتی ہو، اور نہ قوم کے احساسات، جذبات اور عزائم کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت ہو تو پھر قومیں ایسے ہی انحرافات اور حادثات سے دوچار ہوتی ہیں۔ مشرقی پاکستان ہم نے اس کے نتیجے میں کھو دیا۔ فلسطین کے معاملے میں یاسر عرفات نے یہی کیا۔ عراق میں صدام یہی کھیل کھیلتا رہا اور بالکل اسی طرح اب کرنل قذافی نے بھی ہر احتساب سے بالا ہو کر اپنی دفاعی صلاحیت کو خود ہی دریابرد کر دیا ہے اور کوئی نہیں جو تباہی کے اِنھی ہتھیاروں کے بارے میں اسرائیل کا نام بھی لے! آمریت اور فردِ واحد کی حکمرانی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ اس نظام کا بگاڑ ہے جس میں قوم، پارلیمنٹ، کابینہ، سب غیر متعلّق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارا سب سے پہلا اعتراض یہی ہے کہ جنرل صاحب کو اس اعلان کا حق اور اختیار کس نے دیا؟ انھوں نے دستور، قانون، روایات، قومی احساسات و عزائم، ہر چیز کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور قوم کی قسمت سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی صدارت آج تک آئینی و اخلاقی جواز سے محروم ہے۔ چیف آف اسٹاف بھی وہ محض خود اپنے دعوے اور خود اپنی مدت ملازمت کو توسیع دینے سے بنے ہوئے ہیں جس کا کوئی قانونی اور دستوری جواز نہیں۔ خارجہ پالیسی ہو یا داخلی معاملات، دستور کے تحت صدر وزیراعظم کی ہدایت (ایڈوائس) کا پابند ہے، بجز ان معاملات کے

جہاں دستور نے اس کو اختیار (discretion) دیا ہو۔ لیکن جنرل صاحب خود کو کسی دستور، قانون اور ضابطے کے پابند نہیں اور یہ دستوری نظام سے ایسا انحراف ہے جس کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ کشمیر کا معاملہ پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اسے قائداعظم نے شہ رگ قرار دیا تھا اور اسے قیامِ پاکستان کے نامکمل ایجنڈے کی حیثیت حاصل ہے۔ کشمیر کا تنازع محض پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی سرحدی تنازع نہیں ہے جیسا کہ بے نظیر بھٹو نے بھارت اور چین کے سرحدی تنازعے کے مماثل قرار دے کر کیا ہے۔ یہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ ہے جس کے بڑے حصے پر بھارت نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے اور اس قبضے کو پاکستان ہی نہیں، اقوامِ متحدہ اور بین الاقوامی قانون کے تحت ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ جموں و کشمیر کے عوام نے اس غاصبانہ قبضے کو قبول نہیں کیا اور اس کے خلاف سرگرمِ جہاد ہیں اور بیش بہا قربانیاں دے رہے ہیں۔ پاکستان کی سلامتی اور معاشی وجود ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ پاکستان کے دستور میں دفعہ ۲۵۷ موجود ہے جو کشمیر کے مستقبل کو استصواب رائے سے وابستہ کرتی ہے۔ یہ ہمارا قومی موقف ہے اس میں تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں۔

یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر ہمارا اور کشمیری عوام کا موقف جس قانونی، سیاسی اور اخلاقی بنیاد پر استوار ہے وہ اقوام متحدہ کی قراردادیں ہی ہیں۔ بھارت نے یہ دعویٰ کیا کہ ڈوگرہ مہاراجا نے بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیے ہیں (جس کا کوئی ثبوت نہیں)۔ پھر ایک نام نہاد دستور ساز اسمبلی نے اس الحاق کی توثیق کر دی اور اس طرح وہ بھارت کا اٹوٹ انگ بن گیا۔ اقوامِ متحدہ نے بھارت کے اس دعوے کو غلط قرار دیا اور بالآخر خود بھارت نے تسلیم کیا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ہونا باقی ہے جو وہاں کے عوام کی مرضی کو استصواب کے ذریعے معلوم کر کے کیا جائے گا۔

وقت کے گزرنے سے اس مسئلے کے قانونی، سیاسی اور اخلاقی کسی بھی پہلو پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یورپی استعمار کئی صدیوں تک درجنوں ممالک پر قابض رہے مگر اس سے ان کے

آزادی کا حق متاثر نہیں ہوا۔ میکاؤ کا چینی علاقہ ۵۰۰ سال استعمار کے قبضے میں رہا لیکن اس پر چین کا حق ثابت رہا اور بالآخر وہ چین کو حاصل ہوگیا۔ ہانگ کانگ ۱۰۰ سال برطانیہ کے قبضے میں رہا لیکن پھر چین کی طرف لوٹا۔ مرورِ زمانہ کا ان معاملات پر کبھی اثر نہیں پڑتا لیکن ظلم ہے کہ جس طرح برطانوی سامراج نے کشمیری عوام کو نظرانداز کر کے ڈوگروں کے ہاتھوں انھیں فروخت کر دیا تھا اسی طرح ہم اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے دستبردار ہوکر خود اپنے اور کشمیری عوام کے قانونی موقف پر خاک ڈال رہے ہیں۔ اگر اقوام متحدہ کی قراردادوں کو ہٹا دیا جائے تو پھر ڈوگرہ مہاراجا کی دستاویز الحاق کے سوا کیا چیز باقی رہ جاتی ہے؟

اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں بہت کچھ ہے اور چند باتوں کا تعلّق استصواب کے طریق کار کی تفصیلات سے ہے جو جزوی اور ضمنی ہیں۔ جوہری باتیں صرف تین ہیں، یعنی:

۱- جموں و کشمیر کی ریاست کے مستقبل کا مسئلہ متنازع اور غیر تصفیہ شدہ ہے اور اس امر کو ابھی طے ہونا ہے کہ ریاست کے مستقبل کی حیثیت (status) کیا ہوگی؟

۲- ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاست کے عوام اپنی آزاد مرضی سے کریں گے۔

۳- یہ فیصلہ بین الاقوامی انتظام میں آزاد استصواب رائے کے ذریعے ہوگا جس میں بھارت یا پاکستان کسی کی مداخلت نہ ہو، اور وہاں کے عوام شفاف طریقے سے اپنا مستقبل طے کرلیں۔

یہ کوئی سرحدی تنازع نہیں اور نہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے جیسا کہ بھارت دعویٰ کرتا ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ جن قراردادوں کو ایک طرف رکھ دینے کی بات جنرل صاحب نے کی ہے وہ کیا اصول طے کر رہی ہیں اور ان کو ایک طرف رکھنے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔

سب سے اہم مرکزی قرارداد ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی ہے۔ UNCIP کی یہ قرارداد اہم قانونی بنیاد ہے جس میں یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ:

ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان سے الحاق کا مسئلہ ایک آزادانہ اور غیر جانبدار استصواب کے جمہوری ذریعے سے طے کیا جائے گا۔

یہ قرارداد ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد پر مبنی ہے جس میں پاکستان اور بھارت نے اس

اصول کو تسلیم کیا تھا یعنی:

حکومتِ ہندستان اور حکومتِ پاکستان اپنی اس خواہش کا ازسرنو اعلان کرتے ہیں کہ جموں و کشمیر کی ریاست کے مستقبل کی حیثیت کا تعین عوام کی رائے کے مطابق کیا جائے اور اس مقصد کے لیے طے شدہ شرائط کے مطابق دونوں حکومتیں کمیشن کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کر رہی ہیں تاکہ ایسے منصفانہ اور معتدل حالات پیدا کیے جاسکیں جن میں آزادانہ اظہار یقینی ہو۔

جب بھارت نے کشمیر میں نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ان قراردادوں سے نکلنے کی کوشش کی تو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو دوٹوک الفاظ میں یہ طے کیا:

The Security Council,

Having heard statements from representatives of the Governments of India and Pakistan concerning the dispute over the State of Jammu and Kashmir,

Reminding the Government and authorities concerned of the principle embodied in its resolutions of 21 April 1948 (S/726), 3 June 1948, March 1950 (S/1469) and 30 March 1951 (S/2017/Rev,1), and the United Nations Commission for India and Pakistan resolutions of 13 August 1948 (S/1100, Para 75) and 5 January 1949 (S/1196, Para 15),that the final disposition of the State of Jammu and Kashmir will be made in accordance with the will of the people expressed throûgh the democratic method of a free and impartial plebiscite conducted under the auspices of the United Nations,

1. Reaffirms the affirmation in its resolution of 30 March 1951 and declares that the convening of a Constituent Assembly as recommended by the General Council of the "All Jammu and Kashimr National

Conference" and any action that Assembly may have taken or might attempt to take to determine the future shape and affiliation of the entire State or any part thereof, or action by the Assemby, would not constitute a disposition of the State in accordance with the above principle;

2. Decides to continue its consideration of the dispute.

(Resolution Adopted by the Security Council, 24 January 1957 (S/3779).

واضح رہے کہ اقوامِ متحدہ اور اس کے متعلقہ اداروں نے کشمیر کے مسئلے پر ۱۸ قراردادیں منظور کی ہیں اور کشمیر کا مسئلہ آج بھی اقوامِ متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے۔

ہم یہ بات بھی بڑے دکھ سے کہنے پر مجبور ہیں کہ جس طرح جنرل صاحب قِسم قِسم کے بیانات کی چاند ماری کر رہے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاست خارجہ کے بنیادی اصولوں اور اسالیب تک سے ناواقف ہیں۔ ایسے اعلانات کر کے وہ خود اپنی قوم کے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔

یہ بھی سفارت کاری کا ایک اصول ہے کہ مذاکرات شروع ہونے سے پہلے کوئی کھلاڑی اپنے بہترین پتے میز پر نہیں ڈالتا لیکن جنرل صاحب کا انداز ایک ماہر سفارت کار کا نہیں ایک اناڑی جواری کا سا ہے جس کے مقدر میں اپنی دولت لٹانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

بھارت کی قیادت سے معاملہ کرنے کا گر کسی کو سیکھنا ہو تو قائداعظم سے سیکھے جنھوں نے کانگریس کی قیادت سے پچاس سال چومکھی لڑی اور بالآخر پاکستان حاصل کر کے رہے۔ نہرو اور بھارتی صحافت ان پر پھبتی کستے تھے کہ جناح کے پاس کیا دھرا ہے وہ ایک ٹائپ رائٹر کے سہارے اپنی لڑائی لڑ رہے ہیں لیکن قائداعظم نے قوم کو ساتھ لے کر دو دشمنوں کا مقابلہ کیا یعنی انگریز حکمران اور کانگریس قیادت۔

۱۹۰۶ء میں جداگانہ انتخاب کے مطالبہ سے لے کر ۱۹۴۶ء میں مشرقی اور مغربی

پاکستان کے لیے راہداری کے مطالبے تک وہ کانگریس کی قیادت سے جان دار سفارت کاری کے ذریعے اپنے مطالبات منواتے رہے، اور ہر کامیابی کے بعد نئے مطالبات پر بات چیت کے لیے اسے مجبور کرتے رہے، جب کہ ہماری قیادت کا یہ حال ہے کہ نیوکلیر پاور ہوتے ہوئے بھی صرف رعایتیں دے رہے ہیں، بھارتی مطالبات مان رہے ہیں، مسلسل پسپائی اختیار کر رہے ہیں اور پھر بھی ابھی تک ان کو مذاکرات کی میز پر لانے کی بھیک ہی مانگ رہے ہیں۔ سفارت کاری کا یہ اسلوب ذہنی شکست اور سیاسی اور مادی کمزوری کا مظہر ہے۔ جنرل صاحب نے یہ راستہ اختیار کر کے پوری قوم کا منہ کالا کیا ہے اور ہمارے قومی مفاد پر ضرب کاری لگائی ہے۔ امریکہ کے آگے تو انھوں نے گھٹنے ٹیکے ہی تھے اور اب بھارت کے آگے بھی ہتھیار ڈالتے نظر آرہے ہیں۔ کیا قوم نے اس ملک کی فوج کو اپنا پیٹ کاٹ کر اسی ذلت کے لیے منظم اور مضبوط کیا تھا؟

ہم صاف کہنا چاہتے ہیں جنرل صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ ان کی ذاتی پسپائی تو ہوسکتی ہے پاکستان کی قوم کی پالیسی اور موقف نہیں ہوسکتا اور جموں و کشمیر کے غیور مسلمان بھی اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی، ایمان اور تہذیبی شناخت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور پاکستانی قوم ان کے ساتھ ہے۔ وہ سیاسی جدوجہد سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں اور ان شاء اللہ ایک دن اسے حاصل کر کے رہیں گے۔ بھارت کی سات لاکھ فوج ان کے عزم و ایمان اور جذبۂ جہاد کو مضمحل نہ کرسکی۔ موجودہ پاکستانی قیادت کی بے وفائی بھی ان شاء اللہ ان کی ہمتوں کو پست نہیں کرسکتی اور ان کو یقین ہے کہ پاکستانی قوم ان کے ساتھ ہے اور سب سے بڑھ کر وہ جن کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ان کا اصل سہارا ہے۔ پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے کہ کشمیر پالیسی کا ایک بار پھر صاف الفاظ میں اعلان کرے اور جنرل صاحب کا احتساب کرے تاکہ وہ یا کوئی اور طالع آزما قوم کے اصولی موقف سے ہٹ کر کوئی بات نہ کہہ سکے۔

کشمیر کا مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اور بھارت ہی نہیں پوری دنیا کو اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ امن وہی دیرپا ہوسکتا ہے جو انصاف پر قائم ہو۔ ظلم اور مجبوری کی خاموشی یا محکومی ہمیشہ عارضی ہوتی ہے اور حق بالآخر غالب ہو کر رہتا ہے۔ پاکستانی قوم اور جموں و کشمیر کے مسلمان ان

۸۰ ہزار شہیدوں کے خون سے کبھی غداری اور بے وفائی نہیں کریں گے جنھوں نے حق اور اصول کی خاطر اپنی جانیں دی ہیں۔ سیاسی جدوجہد ہو یا فوجی مقابلے--- ان میں نشیب و فراز تو آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں لیکن جو قوم اپنی آزادی اور ایمان کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے کا عزم کر لیتی ہے پھر اسے کوئی محکوم نہیں کر سکا۔ عزت اور آزادی وہ چیزیں ہیں جن کا سودا نہیں کیا جاتا اور حق وہ شے ہے جو اپنی ذات میں حق ہے۔ وہ اعتدال' سمجھوتے اور انتہاپسندی کی اصطلاحوں سے بالاتر شے ہے۔ نہ وہ کسی تراش خراش کا متحمل ہوتا ہے اور نہ اسے کسی جھوٹے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی بیساکھیوں کا محتاج نہیں' بلکہ خود اپنی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور بالآخر باطل پر غالب رہتا ہے۔ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقًا۔

آج پاکستانی قوم کے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ امریکہ اور بھارت کی خوشنودی حاصل کر کے کیا اور کہاں کہاں لچک دکھائے بلکہ اصل ایشو یہ ہے کہ اپنی آزادی' اپنا ایمان' اپنا دین' اپنی تہذیب' اپنی معیشت اور اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کس طرح سینہ سپر ہو جائے تاکہ باہر سے دباؤ ڈالنے والوں اور اندر سے دبنے والوں دونوں کا مقابلہ کر کے اپنا اصل مقام حاصل کرے۔ استقامت اور حکمت ہی ہمارا اصل زادِ راہ ہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ پر بھروسا اور اس سے مدد اور نصرت کی طلب!

جوے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اکھنڈ بھارت کا نیا نقشۂ راہ

پروفیسر خورشید احمد

ہندو ذہن اور سیاست برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ہمارے تجربات ہزار سال پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی وہ نئی نسل جسے آزادی کے بعد کی فضا میں پلنے کا موقع ملا ہے بدقسمتی سے اس تاریخ اور تجربے سے نابلد ہے۔ پاکستان کا قیام کسی وقتی مصلحت کے تحت نہیں ہوا بلکہ ساری جدوجہد مسلمانوں کے جداگانہ تہذیبی اور نظریاتی تشخص کی حفاظت کے لیے تھی۔ بھارت کی قیادت ایک بار پھر تقسیم کی لکیر کو مٹانے اور اکھنڈ بھارت کے لیے نئے نقشۂ راہ (road map) پر عمل پیرا ہونے کے لیے سرگرم ہے۔ واجپائی صاحب یا تو ملاقات سے گریزاں اور سارک کانفرنس میں آنے اور نہ آنے کے باب میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، یا ایک دم ''نرم سرحدوں' اور مشترک کرنسی'' کی بات کرنے لگے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ ٹریک ٹو اقدامات ہیں جن کی تفصیل ایک سابق سفارت کار نیاز نائیک نے ۱۸دسمبر ۲۰۰۳ء کے ڈان میں بیان کی ہے اور جس کا ہدف ۲۰۱۰ء تک پاکستان کو بھارت کے مشترک کرنسی کے جال میں پھنسانا اور بھارت کی معاشی اور مالیاتی گرفت میں دے دینا ہے۔ اب تک اس منصوبے پر ایک طرح سے خاموشی سے کام ہو رہا تھا مگر اب اسے کھل کر بیان کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں بائیسویں میٹنگ ۱۸-۲۲ جنوری ۲۰۰۴ء کو متوقع ہے۔ نائیک صاحب کے الفاظ میں اس نقشۂ راہ کو سمجھ لیجیے:

دونوں فریق جلد ہی تین بڑے مسائل پر گفتگو کریں گے: دفاعی بجٹ میں کمی، جوہری

پابندی پر دستخط اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات کا فروغ۔ ان بڑے مسائل پر ابتدائی تفہیم کشمیر کے مسئلے کے حل کی طرف لے جائے گی۔ ہم نے ہندستان پاکستان کے لیے ایک نئی مشترک کرنسی جس کا نام ''روپا'' ہو' ۲۰۱۰ء تک رائج کرنے کی تجویز پیش کی ہے' اور اس حوالے سے ہمیں دونوں حکومتوں سے حوصلہ افزا ردعمل ملے ہیں۔ یہ آزادانہ منتقل ہونے والی کرنسی ہوگی جس کا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی حمایت سے اجرا کیا جائے گا۔ ہماری غیر رسمی ملاقات کا مقصد اشیا کی آزادانہ نقل وحمل میں سہولت ہے تاکہ یورپی یونین کے طرز پر ایک معاشی یونین بن سکے۔ ہم علاقائی اتحاد کے لیے کام کر رہے ہیں اور دونوں فریقوں کو اس معاملے میں اپنی متعلقہ حکومتوں کی بڑھتی ہوئی حمایت حاصل ہے۔

واجپائی صاحب کے بیان کا پس منظر نیاز نائیک کے تفصیلی نقشۂ کار سے سامنے آجاتا ہے اور صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ اصل اہداف کیا ہیں۔ یہ خطرناک کھیل مختلف سطحوں پر کھیلا جارہا ہے اور اس نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق سیکڑوں افراد متحرک ہوگئے ہیں اور روزانہ کسی نہ کسی طائفے یا وفد کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ وہ وقت آگیا ہے کہ تمام حقائق سے قوم کو آگاہ کیا جائے اور اسے بیدار کیا جائے کہ اس کے اپنے ملک کی قیادت کس طرح ملک کی آزادی' حاکمیت' معاشی خودمختاری اور تہذیبی تشخص کو داؤ پر لگانے پر تلی ہوئی ہے۔ یورپ کی مثالیں بڑی خوش کن ہیں مگر کیا ہمارے تاریخی تجربات اور یورپ کے دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حالات میں کوئی مناسبت ہے؟ اور کیا ہمارے علاقے کے زمینی حقائق جن میں بھارت کا حجم' عزائم اور علاقائی ہی نہیں عالمی طاقت بننے اور بالادستی مسلط کرنے کے اہداف شامل ہیں' کسی ایسے وژن کے لیے کوئی جواز فراہم کرسکتے ہیں؟

علاقے کا کون سا ملک ہے جو بھارت سے زخم خوردہ نہیں۔ پاکستان تو پہلے ہی دن سے خصوصی ہدف ہے لیکن کیا بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء کی ساری لفاظی کے علی الرغم آج بھارت کی چیرہ دستیوں پر چلاّ نہیں رہا؟ سری لنکا کی خانہ جنگی میں بھارت کا کیا کردار رہا ہے؟ مالدیو کو کس طرح قابو میں کیا گیا ہے؟ نیپال اور بھوٹان ہندو اور بدھ ریاستیں ہونے کے باوجود کس طرح بھارت کی

سازشوں اور دست درازیوں کا شکار ہیں؟ خود سارک آج تک کیوں پنپ نہیں سکی؟ کیا یورپ میں معاشی یونین جرمنی اور فرانس کے تنازعات کو طے کرنے اور ان دونوں بڑے ملکوں کے مسلسل قربانیاں دینے کے بغیر وجود میں آ گئی؟ کیا یورو' معاشی اور مالیاتی پالیسیوں میں ہم آہنگی اور یورپ کے ایک مرکزی بنک اور مارسٹرک ٹریٹی کے تحت بجٹ سازی کی پالیسی پر ۲۰ سال عمل کرنے سے پہلے وجود میں آ گیا تھا' اور کیا آج بھی یونین کے سارے ممالک نے یورو کو اختیار کرلیا ہے؟ غرض سیاسی' تہذیبی اور معاشی ہر پہلو سے یہ تمام ترک تازیاں نہ صرف غیر حقیقت پسندانہ ہیں بلکہ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری پر ضرب کاری ہیں اور بے وقت کی راگنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ البتہ یہ سب ایک خطرناک کھیل کا ضرور پتا دیتی ہیں جس کو سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا پاکستانی قوم کی ضرورت ہے۔

تعلیم کا المیہ

پاکستان کے ایک تحقیقی ادارے Social Policy and Development Centre نے ۲۰ دسمبر ۲۰۰۳ء کو اپنی ایک رپورٹ پاکستان کے تعلیمی حالات پر شائع کی ہے جس پر قومی سطح پر غور نہ کرنا ایک مجرمانہ غفلت ہوگا۔ یہ رپورٹ کسی سیاسی ادارے کی طرف سے نہیں آئی اور اس کا مقصد کسی ایک حکومت کا احتساب نہیں بلکہ اصل میں پوری قوم کا احتساب ہے اور اب تک کی ساری ہی حکومتوں کی ناکامی پر قومی گرفت کی ضرورت کی دعوت ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۲ء میں پاکستان میں ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد ناخواندہ تھے جن کی تعداد اب ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ ۵ سے ۹ سال کی عمر کے بچوں کے اسکول میں داخلے کی صورت حال بھی اندوہناک ہے۔ ایسے ۵ کروڑ بچوں میں سے عملاً صرف ایک کروڑ ۳۰ لاکھ پرائمری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان میں بھی اسکول چھوڑنے والوں کی شرح جو ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۴۰ فی صد تھی وہ ۱۹۹۹ء--۲۰۰۰ء میں بڑھ کر ۴۲ فی صد ہوگئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک سے

مقابلے کا تو کیا سوال اس وقت عالم یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھی پاکستان ناخواندگی اور اسکول میں داخلوں کے اعتبار سے سب سے پیچھے ہے۔ بنگلہ دیش' سری لنکا اور نیپال بھی ہم سے آگے ہیں۔ اسی طرح ہم دنیا کے ان ۱۲ ممالک میں شامل ہیں جو اپنی قومی آمدنی کا ۲ فی صد سے بھی کم تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں گذشتہ ۵۰ سال کا اوسط ۸.۱ فی صد ہے۔

اس کے ساتھ دوسرا بڑا مسئلہ تعلیم کے نظام میں یکسانیت کی کمی ہے جس سے قوم طبقوں میں بٹ رہی ہے اور بالکل مختلف ذہنی رویے وجود میں آ رہے ہیں۔ اس وقت نظامِ تعلیم' اپنے میں مگن تین منطقوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ ایک طرف انگریزی میڈیم اسکول ہیں جو بالکل دوسرا ذہن پیدا کر رہے ہیں اور دوسری طرف اُردو میڈیم اسکول ہیں جن کی تعلیمی حالت بھی دگرگوں ہے اور ان کا ذہنی اُفق بھی بالکل مختلف ہے۔ تیسرا طبقہ دینی تعلیمی اداروں کا ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق انگریزی میڈیم کے طلبہ کا دو تہائی بھارت سے دوستی' آزاد پریس' عورتوں کی مساوات' جمہوریت اور کشمیر کے مسئلے پر بھی صرف پرامن ذرائع کا قائل ہے' جب کہ ایک تہائی یا اس سے بھی کم جہاد کشمیر اور شریعت کے نفاذ کے حق میں ہے۔ اس کے برعکس اُردو میڈیم اور دینی مدارس کے طلبہ کی عظیم اکثریت شریعت کے نفاذ اور جہاد کشمیر کے حق میں ہے۔ رپورٹ کے مرتبین یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

> ہم ملک میں ایک سے زیادہ پاکستان تخلیق کر رہے ہیں۔ یہ طلبہ زندگی کے بارے میں متضاد نظریے رکھتے ہیں' جس کے نتیجے میں ملک غیر مستحکم ہونے سے دوچار ہے۔
> (ڈان' ۲۱ دسمبر ۲۰۰۳ء)

یہ رپورٹ ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتی لیکن جس طبقے کی طرف سے یہ آئی ہے' اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ملک کی سیکولر لیڈرشپ بھی حالات پر پریشان ہے۔ بنیادی مسائل دو ہی ہیں: ایک' تعلیم پر توجہ' وسائل اور مؤثر قومی جدوجہد کی کمی اور دوسرے' نظریاتی' اخلاقی اور تہذیبی اعتبار سے تعلیم کا معاشرے اور قومی مقاصد سے متصادم ہونا۔ وزیراعظم ظفراللہ جمالی صاحب نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں ایک ہی مثبت بات کہی تھی کہ تعلیم کو ملک کی شناخت سے ہم آہنگ کرنا اور ملک میں ایک نصاب کی ترویج۔ لیکن عملاً ابھی تک

اس کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی کیونکہ استعماری مفادات کی اسیر این جی اوز نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

آج کمیت (quantity) اور کیفیت (quality) دونوں اعتبار سے تعلیم کی حالت زاروزبوں ہے۔ یہ قوموں کی ترقی نہیں تنزل اور تباہی کا راستہ ہے۔ قوم اور پارلیمنٹ کو تعلیم کے مسئلے کو اولیت دینی چاہیے اور کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اصلاحِ احوال کی فوری فکر کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں اسلامی جمعیت طلبہ تمام طلبہ تنظیموں اور اساتذہ کے تعاون سے جو کوشش کر رہی ہے وہ بہت لائقِ تحسین اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام تمام دینی اور سیاسی جماعتوں اور سب سے بڑھ کر حکومت اور پارلیمنٹ کے کرنے کا ہے۔ اور ترجیحی بنیادوں پر کرنے کا ہے تاکہ ہم اپنی نئی نسلوں کو تباہی سے بچاسکیں اور پاکستان عالمی برادری میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔

آدابِ تلاوتِ قرآن

تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو

آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو

اور ایک ایک آیت پر ٹھیرو

تاکہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے

اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔

کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو

کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذبات تشکر سے لبریز ہو جائے

کہیں اس کے غضب اور عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو

کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے

غرض یہ کہ قرأت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں، بلکہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ہونی چاہیے۔

(تفہیم القرآن، ج ٦، ص ١٢٦-١٢٧)

(خیر خواہ)

خطبۂ عید: پیغامِ اتحادِ اُمت

ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات بے حدوحساب ہیں جن کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا' لیکن بلاشبہہ اُس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے ہم کو خالص توحید اور بے آمیز توحید کی تعلیم دی جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات' اختیارات اور حقوق میں کسی دوسرے کی ادنیٰ سے ادنیٰ شرکت کے لیے بھی کوئی گنجایش نہیں ہے اور تمام حیثیتوں سے خدائی صرف ایک معبودِ برحق کے لیے مخصوص ہے۔ یہ کتنی بڑی نعمت ہے' اس کی صحیح قدر آپ صرف اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب توحید اور شرک کے فرق کو بخوبی سمجھ لیں۔

شِرک کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کو بانٹتا اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جو یہ شہادت دیتی ہو کہ تمام دُنیا کے مشرکین کسی ایک معبُود پر' یا چند معبُودوں پر کبھی جمع ہوئے ہوں۔ ساری دنیا تو درکنار' زمین کے ایک خطّے میں بسنے والے مشرک بھی کسی معبُود یا معبُودوں کے کسی گروہ پر متفق نہیں پائے گئے۔ قبیلوں اور قبیلوں کے معبُود الگ الگ رہے ہیں اور یہ جُدا جُدا بھی ہمیشہ معبُود نہیں رہے بلکہ زمانے کی ہر گردش کے ساتھ بدلتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح شِرک کبھی کسی دَور میں بھی انسانیت کو جمع کرنے والی طاقت نہیں رہا بلکہ ایک تفرقہ پرداز طاقت رہا ہے اور وہ صرف عقیدے ہی کے اعتبار سے انسانوں کو ایک دوسرے سے نہیں پھاڑتا۔ اُس کی فطرت چونکہ متحد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے اس لیے جو تفرقے اُس کی بدولت برپا ہوتے ہیں وہ رفتہ رفتہ انسانوں میں قوموں اور قبیلوں اور نسلوں اور زبانوں اور رنگوں اور وطنوں کے اختلافات اُبھار دیتے ہیں۔

پھر یہی اختلافات آگے بڑھ کر لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ذلیل وحقیر اور ناپاک اور اچھوت سمجھنے کے محرک بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حق مارنے اور ایک دوسرے پر ظلم ڈھانے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انھی کی بدولت دُنیا میں خونریزیاں ہوتی ہیں، قتل وغارت کا بازار گرم ہوتا ہے، لڑائیاں ہوتی ہیں اور شر وفساد سے خدا کی زمین بھر جاتی ہے۔ آج تک جتنی لڑائیاں بھی انسانوں اور انسانوں کے درمیان ہوئی ہیں، آپ ان کے اسباب کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے پیچھے شرک کسی نہ کسی صورت میں کارفرما رہا ہے یا اُس کی پیدا کردہ خباثتوں میں سے کوئی خباثت اُن کی محرک ہوئی ہے۔

اس کے برعکس توحید اگر شرک کی ہر آمیزش سے پاک ہو، تو اُس کا لازمی خاصہ انسانیت کو بانٹنے اور انسانوں کو انسانوں سے پھاڑنے کے بجاے ان کو باہم جوڑنا اور ایک رب العالمین کی بندگی واطاعت پر جمع اور متحد کرنا ہے۔ جتنے لوگ بھی مخلوقات کی خدائی کے ہر تصور سے اپنے ذہن کو پاک کر کے صرف ایک خدا کو معبُودِ برحق مان لیں گے اور خداوند عالم کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی کسی مخلوق کی شرکت کے باطل خیال کو اپنے دل ودماغ کے ہر گوشے سے نکال باہر کریں گے، وہ لازماً ایک اُمت بنیں گے۔ یقیناً ان میں وحدت پیدا ہوگی۔ ضرور وہ ایک دوسرے کے رفیق اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں گے۔ تاریخ میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک اللہ کی وحدانیت کے سوا کوئی دوسری چیز انسانوں کو جمع کرنے والی پائی گئی ہو۔ اگر انسان جمع ہوسکتے ہیں تو صرف اُس ایک معبُود پر جو حقیقتاً ساری کائنات کا معبُود ہے۔ اُسی کو ماننے پر اُن کے اندر اتحاد پیدا ہوسکتا ہے اور اُسی کی بندگی پر اتفاق اُنھیں ایک دوسرے کا بھائی بنا سکتا ہے۔ توحیدِ الٰہ کا نتیجہ توحیدِ اُمت ایک ایسی اَٹل حقیقت ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی ہے نہ غلط ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر کبھی کسی جگہ آپ دیکھیں کہ توحید پر ایمان کا دعویٰ تو موجود ہے، لیکن اس کا دعویٰ کرنے والی اُمت میں وحدت موجود نہیں ہے، بلکہ اُلٹے تفرقے اور تعصّبات اور باہمی نفرت ومخالفت کے فتنے برپا ہیں، تو چشمِ بصیرت سے اُن کا جائزہ لے کر آپ بآسانی معلوم کرلیں گے کہ اُس اُمت میں شرک گھس آیا ہے اور اُس کے بے شمار

شاخسانوں میں سے کوئی نہ کوئی شاخسانہ اس کے افراد اور گروہوں کو ایک دُوسرے سے پھاڑ رہا ہے۔ یہ بات نہ ہو تو جس طرح دو اور دو پانچ نہیں ہو سکتے، اسی طرح شرک کی آمیزش کے بغیر ایک خدا کے ماننے والے دس متحارب گروہوں میں بٹ نہیں سکتے۔

وحدت اُمت کے لیے بنیادیں

اب دیکھیے کہ تمام انسانوں کو ہر زمانے اور ہر دور میں ایک اُمت کے اندر جمع کرنے کے لیے توحید کی بنیاد فراہم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس وحدت کو دائم و قائم رکھنے کے لیے مزید کیا اہتمام فرمایا ہے۔

ھدایت کا واحد ماخذ: اس نے ایک رسول بھیج کر اور ایک کتاب نازل کر کے انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کے لیے ایک ایسی رہنمائی عطا فرما دی جس سے باہر جا کر انسان کو کہیں اور ہدایت تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایک اُمت میں جمع ہو جانے کے بعد انسان اگر متفرق ہو سکتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ان کو کسی ایک ماخذ سے پورا نظامِ زندگی نہ ملے اور وہ مختلف حالات، مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں دوسرے ذرائع سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہوں۔ ایسی صورت میں تو بلاشبہہ انسان ہدایت کے لیے بہت سے ذرائع کی طرف رجوع کریں گے اور اس سے لازماً ان کے اندر تفرقہ برپا ہوگا، لیکن جب ہر زمان و مکان کے لیے ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ذریعے سے ہدایت مل جائے تو وحدتِ معبُود پر جمع ہونے والی اُمت کے لیے تفرقے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا اِلا یہ کہ لوگ یا تو جہالت کی بنا پر اس کی ہدایت سے واقف ہی نہ ہوں یا پھر ذہن و فکر کی کجی کے باعث اصل ہدایت میں اپنی طرف سے کچھ گھٹائیں اور کچھ بڑھائیں، اور اس طرح کی کمی وبیشی کرنے والا ہر گروہ یہ دعویٰ کرے کہ اُس کا تیار کردہ دین ہی اصل دین ہے جس کی پیروی نہ کرنے والا گمراہ یا فاسق یا کافر ہے۔

صرف خدا کے سامنے جواب دھی: دوسری اہم چیز جو وحدتِ اُمت کے استحکام اور راہِ راست پر اس کے ثابت قدم رہنے کے لیے فراہم کی گئی ہے وہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان

صرف ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہی ایک خدا دنیا میں بھی اُس کی قسمت بنانے اور بگاڑنے کے مکمل اختیارات رکھتا ہے اور وہی ایک خدا روزِ جزا کا بھی مالک ہے۔ اُس کے سوا نہ کوئی انسانوں کے اعمال کی بازپرس کرنے والا ہے نہ کسی کے ہاتھ میں سزا یا جزا دینے کے اختیارات ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ عقیدہ نہ صرف وحدتِ اُمت کا ضامن ہے بلکہ اِسی پر انسانی سیرت و کردار کے راست و درست رہنے کا انحصار ہے۔ اِس عقیدے کے اِن لازمی نتائج کو ضائع کر کے اگر کوئی چیز انسانوں کو پراگندہ اور بے راہ رو بنانے والی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ دنیا میں خدا کے سوا دوسری مختلف ہستیوں کو حاجت روا قرار دینے لگیں، اور آخرت کے بارے میں یہ سمجھنے لگیں کہ وہاں خدا کے انصاف میں مداخلت کرنے کے اختیارات کچھ دوسری ہستیوں کو حاصل ہوں گے۔

پنج وقتہ نماز کا اہتمام: اس کے بعد دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی چیزیں ہم پر لازم کی ہیں جو وحدتِ اُمت کو عملاً قائم اور دائماً سرگرم رکھنے والی ہیں۔ اُن میں اوّلین چیز نماز ہے جو روزانہ پانچ وقت کے لیے دنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض کر دی گئی ہے۔ اُس کے لیے ایک قبلہ مقرر ہے جس کی طرف ہر نماز کے وقت مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب اور اِن مختلف سمتوں کے درمیان رہنے والے سب مسلمانوں کو رُخ کرنا ہوتا ہے۔ اِس نقشے کو ذرا چشمِ تصور کے سامنے لا کر تو دیکھیے کہ خانۂ کعبہ کے گرد نماز پڑھنے والے تمام لوگ ایک ہالہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر یہی دائرہ پھیلتے پھیلتے تمام روے زمین پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہ روزانہ پانچ وقت کا عمل ہے۔ اس سے بڑھ کر وحدت کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے اور اسلام کے سوا یہ مظاہرہ آپ اور کہاں پاتے ہیں؟

اس پنج وقتہ نماز کو فرض کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازم کیا ہے اِلا یہ کہ کوئی مسلمان اپنی جگہ تنہا ہو اور اسے جماعت نہ مل رہی ہو۔ اللہ کی عبادت کا مقصد تو فرداً فرداً نماز پڑھنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا، مگر وحدت اُمت کا مقصد نماز باجماعت کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے لازم کیا گیا کہ جہاں دو مسلمان بھی موجود ہوں وہاں ایک امام اور دوسرا مقتدی بنے اور دونوں مل کر باجماعت نماز ادا کریں۔

نماز کے لیے لوگوں کو بُلانے کا طریقہ بھی اسلام میں ایسا بے نظیر مقرر کیا گیا ہے جو دنیا کے کسی مذہبی یا لامذہب گروہ کو اپنے کسی اجتماع کی دعوتِ عام دینے کے لیے میسر نہیں ہے۔ نماز کا بلاوا دینے کے لیے روے زمین پر ہر جگہ ہر روز پانچوں وقت ایک ہی زبان میں اذان کی آواز بلند کی جاتی ہے' قطع نظر اِس سے کہ بلانے والوں اور بلائے جانے والوں کی اپنی زبان خواہ کچھ بھی ہو۔ اِس مشترک زبان کی اذان دُنیا میں جہاں بھی بلند ہوگی اسے سننے والا ہر مسلمان جان لے گا کہ یہ نماز کا بلاوا ہے اور فلاں مقام سے بلند ہو رہا ہے جہاں مجھے اپنے برادرانِ ملت کے ساتھ جمع ہوکر خداے واحد کی عبادت بجالانی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اذان صرف نماز کا بلاوا ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کے پورے عقیدے کا اعلان بھی ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبُود نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں۔ اور میری فلاح اُسی ایک خدا کی عبادت سے وابستہ ہے جس کی طرف آنے کے لیے مجھے پکارا جا رہا ہے۔ کیا اِس سے بہتر طریق دعوت کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے؟ یہ دعوت دُنیا میں ہر جگہ لوگوں کو نماز کے لیے جمع بھی کرتی ہے اور ایک ہی عقیدے پر متفق بھی۔

پھر نماز کے اوقات' اُس کو ادا کرنے کے طریقے اور اس میں پڑھی جانے والی چیزیں تمام دنیا میں یکساں ہیں۔ بعض جزوی چیزوں میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ ایسا نہیں ہے کہ جنوبی افریقہ کا مسلمان شمالی امریکہ میں یا جاپان کا مسلمان مراکو یا فرانس میں جا کر یہ محسوس کرے کہ یہاں نماز کے بجاے کوئی اور عبادت کی جارہی ہے۔ اس طرح یہ نماز خدا پرستی کے جذبے کو تازہ بھی کرتی ہے اور خدا پرستوں میں عالم گیر برادری کا احساس زندہ و متحرک بھی رکھتی ہے۔

روزوں کا اہتمام: ایسا ہی معاملہ روزوں کا بھی ہے۔ اگر صرف روزے کی عبادت ہی مقصود ہوتی تو ہر مسلمان کو بس یہ حکم دے دینا کافی تھا کہ وہ سال میں ۳۰ روزے جب چاہے رکھ لے۔ لیکن خداے واحد کی عبادت کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اُمتِ واحدہ بھی بنانا مقصود تھا' اس لیے رمضان کا ایک ہی مہینہ ہر سال روزے رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تاکہ سب کا روزہ ایک ساتھ شروع اور ایک ہی ساتھ ختم ہو۔ روزے کے احکام بھی یکساں رکھے گئے تاکہ تمام مسلمان عمر بھر ہر سال پورے ۳۰ (یا ۲۹) دن کے روزے ایک ہی طریقے سے ایک ہی طرح

کی پابندیوں کے ساتھ رکھتے رہیں۔ اس سے لازماً دنیا بھر کے مسلمانوں میں یہ شعور زندہ اور تازہ رہتا ہے کہ وہ ایک ہی شرع کی پابندی کرنے والی اُمت ہیں۔ اس پر مستزاد تراویح کی نماز ہے جو پنج وقتہ فرض نماز کے علاوہ ساری دنیا میں رمضان کی ہر رات کو باجماعت ادا کی جاتی ہے اور اس میں بالعموم پورا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ یہ عبادت بھی ہے' خدا کے کلامِ پاک کی تبلیغ اور تذکیر بھی ہے اور وحدتِ اُمت کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم کرنے والی چیز بھی۔ قرآن کو ہر سال مہینہ بھر تک روزانہ سننے والے خواہ اُس کی زبان سے واقف ہوں یا نہ ہوں' اُس کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں' بہرصورت اُن سب میں یہ مشترک احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اور وہ کتاب اُن کے رب کی کتاب ہے۔

فریضۂ حج: اب ذرا حج کو دیکھیے جس سے بڑھ کر ملت اسلام کے ایک عالم گیر ملت ہونے کا مظاہرہ کسی دوسری عبادت میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر اُس مسلمان پر جو حج کی استطاعت رکھتا ہو' یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ عمر میں ایک مرتبہ اِس فریضے کو انجام دے اور یہ فریضہ صرف چند مقررہ تاریخوں ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے جو سال بھر میں صرف ایک بار آتی ہیں۔ اس طرح روے زمین پر جہاں بھی مسلمان آباد ہوں وہاں سے ایک ہی زمانے میں تمام ذی استطاعت مسلمانوں کو مکہ معظّمہ میں جمع ہونا پڑتا ہے۔

آپ غور کیجیے یہ وہ چیز ہے جو ہر سال دُنیا کے ہر گوشے سے عام انسانوں کو کھینچ کر ایک جگہ لاتی ہے۔ صرف سیاسی مدبرین کو نہیں لاتی' جیسے اقوامِ متحدہ میں جمع ہوتے ہیں۔ صرف قوموں کے لیڈروں کو نہیں لاتی' جیسے بین الاقوامی کانفرنسوں میں آیا کرتے ہیں۔ یہ ہر ملک اور ہر قوم کے عوام کو لاکھوں کی تعداد میں کھینچ لاتی ہے اور اس غرض کے لیے لاتی ہے کہ وہ سب مل کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ ایک ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف کریں' ایک ساتھ مکہ سے منیٰ اور منیٰ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ کی طرف کوچ کریں۔ ایک ساتھ قربانیاں کریں' ایک ساتھ رمی جمار کریں' ایک ساتھ عرفات میں وقوف اور منیٰ میں چند روز قیام کریں۔ ایک ہی زبان میں سب لبیک لبیک کی آوازیں بلند کریں۔ ایک ساتھ اُس قبلے کے گرد نمازیں ادا کریں جس کی طرف رُخ کر کے ہر روز پانچ مرتبہ وہ اپنی اپنی جگہ نماز پڑھتے رہے ہیں۔

اُن میں ہر نسل، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر وطن کے لوگ یکجا ہوتے ہیں۔ ہر زبان بولنے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھروں سے طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے آتے ہیں۔ اُن میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ شاہ بھی ہوتے ہیں اور گدا بھی۔ مگر وہاں یہ سارے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ حرم کے حدود میں پہنچنے سے پہلے ہی سب کے لباس اُتروا کر ایک ہی طرح کا فقیرانہ لباسِ احرام پہنوا دیا جاتا ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے اور کس کا کیا مرتبہ ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس کے اُونچے مقام سے اُتار کر عام انسانوں کی سطح پر لے آیا جاتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب و تمدن رکھنے والوں کو بھی تمدن کی بالکل نچلی سطح پر رہنے والوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کے ہجوم میں طواف و سعی کرتے ہوئے ایک رئیس کو بھی اُسی طرح دھکّے کھانے پڑتے ہیں جس طرح کوئی عام آدمی دھکّے کھاتا ہے۔ خداوند عالم کے دربار میں پہنچ کر ہر شخص کے دماغ سے کبریائی کا خنّاس نکال دیا جاتا ہے، رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے تعصّبات ختم کر کے دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے مسلمانوں کے اندر ایک اُمت ہونے کا احساس اِس قوت کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے کہ اُس کا اثر کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ دُنیا کے کسی مذہب اور کسی لامذہبی گروہ کے پاس بھی اپنے پیرووں کو اس قدر عالم گیر پیمانے پر متحد کرنے اور ہر سال اس اتحاد کی تجدید کرتے رہنے کا ایسا کیمیا اثر نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ صرف اُس خدا کی حکمت کا کرشمہ ہے جس کی وحدت کو مان کر، جس کے رسول اور جس کی کتاب کی پیروی قبول کر کے، جس کے حضور اپنی جواب دہی کا شعور پیدا کر کے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ ہے کہ اُس نے حج کی اِن برکات کو بھی صرف اُن لوگوں تک محدود نہیں رکھا جو اِس عبادت کے مناسک ادا کرنے کے لیے مرکز اسلام میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ موقع پیدا کر دیا کہ حج ہی کے زمانے میں وہ اپنی اپنی جگہ حاجیوں کے شریکِ حال بن سکیں۔ یہ عیدالاضحیٰ کی نماز اور یہ قربانی جو ان تین دنوں کے اندر زمین کے ہر گوشے میں کی جاتی ہے اِسی غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جس روز (یعنی ۹ رذی الحجہ کو) حج ادا کرنے کے لیے حاجی منیٰ سے عرفات کی طرف

روانہ ہوتے ہیں، اُسی روزصبح سے وہ ہر فرض نماز کے بعد بآواز بلند اللّٰہُ اکبَر اللّٰہُ اکبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ واللّٰہُ اکبَر اللّٰہُ اکبر وَلِلّٰہِ الْحَمد کا ورد شروع کر دیں اور ان تکبیرات کا سلسلہ مزید چار روز تک جاری رکھیں تاکہ منیٰ میں حاجیوں کے قیام کا پورا زمانہ دنیا میں اِن تکبیرات کو بلند کرتے ہوئے گزر جائے۔ عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے وہی ۱۰ ذی الحجہ کی تاریخ رکھی گئی ہے جو حاجیوں کے لیے یَوْمُ النّحر (قربانی کا دن) ہے۔ حکم ہے کہ اس نماز کے لیے جاتے وقت بھی اور واپس ہوتے وقت بھی یہی تکبیرات بلند کی جائیں۔ اسی دن ساری دنیا میں نمازِ عید کے بعد وہی قربانیاں شروع ہو جاتی ہیں جو منیٰ میں حاجی کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا کا ہر مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اُسی اُمت کا ایک فرد ہوں جس اُمت کے لاکھوں آدمی اس وقت حج کر رہے ہیں، اور حج کے پورے زمانے میں وہ تکبیرات کہتے ہوئے، نماز پڑھتے ہوئے اور قربانی کرتے ہوئے، گویا حاجیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ عیدالاضحیٰ میں اگرچہ حج جیسا عظیم اور عالم گیر اجتماع نہیں ہوتا، مگر اپنے اپنے مقام پر مسلمان ہر جگہ بڑے سے بڑا اجتماع کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور مجموعی طور پر تمام روے زمین پر ایک ہی زمانے میں اس عید کا منایا جانا ایک دوسرے انداز میں اُمت کی عالم گیر وحدت کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔

اختصار کے ساتھ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید، رسالت، کتاب اور آخرت کے عقائد سے وہ بنیاد فراہم کر دی جس پر قوم، وطن، رنگ، زبان اور نسل کے تمام تعصبات ختم کر کے دنیا کے سارے انسان ایک عالم گیر اُمت بن سکتے ہیں۔ پھر عبادات کے ایسے طریقے مقرر فرما دیے جو اس اُمت میں محض وحدت ہی نہیں، بلکہ پاکیزہ وحدت، اور سطحی و ناپایدار وحدت نہیں، بلکہ نہایت مضبوط عملی وحدت پیدا کرتے ہیں، اور اس پر مزید یہ کہ اپنے آخری رسولؐ اور اپنی آخری کتاب کے ذریعے سے اُس نے وہ مکمل نظامِ زندگی عطا فرما دیا جو پوری انسانیت کے لیے ہر زمان و مکان میں ایسا جامع قانون ہے کہ اپنی کسی ضرورت کے لیے بھی کسی جگہ اور کسی دور کے انسانوں کو ہدایت کی طلب میں کسی دوسرے ذریعۂ رہنمائی کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

اب اس کے بعد اس سے بڑی بدقسمتی اور شرم ناک بدقسمتی کیا ہوگی کہ جس اُمت کو

اللہ تعالیٰ نے ایسا جامع و مکمل نظامِ حیات دیا، جس اُمت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے اُس نے اِتنا بڑا انتظام کیا، اور جس اُمت کے سپرد اس نے یہ کام کیا کہ وہ دنیا میں اِس دین توحید کو پھیلائے تاکہ پوری انسانیت اِس پر جمع ہو جائے، وہ اپنے اصل کام کو پسِ پشت ڈال کر اپنی اِس وحدت ہی کے ٹکڑے اُڑا دینے پر تل گئی ہے۔ وہ مامور تو اِس خدمت پر تھی کہ دُنیا سے اُن اسباب کو ختم کردے جس کی وجہ سے انسان انسان کو ہیچ سمجھتا ہے، اچھوت سمجھتا ہے، قابلِ نفرت سمجھتا ہے، حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، اور خدا کی زمین کو ظلم و ستم اور قتل و غارت سے جہنّم بنا دیتا ہے۔ اُس کا مشن تو یہ تھا کہ دُنیا کو ایک خدا کی بندگی، ایک قانونِ برحق کی پیروی، اور ایک عالم گیر برادری میں جمع کر کے ظلم کی جگہ عدل، جنگ کی جگہ امن، نفرت و عداوت کی جگہ خیر اندیشی اور محبّت قائم کرے اور نوعِ انسانی کے لیے اُسی طرح رحمت بن جائے جس طرح اس کے ہادی و رہنما محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے، لیکن یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنی قوتیں آپس کے تفرقے برپا کرنے پر صرف کر رہی ہے۔ اس کے لیے سب سے دل چسپ مشغلہ یہ بن گیا ہے کہ اس کے افراد اور گروہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں اور مخالفت کو بڑھا کر نفرت و عداوت کی حد تک لے جائیں۔ نیک نیّتی کے ساتھ رائے اور علم و تحقیق کا اختلاف تو رحمت بن سکتا ہے اور سلف صالحین میں وہ رحمت ثابت بھی ہوا ہے، لیکن اب اس اُمت میں اختلاف کے معنی مخالفت کے ہو گئے ہیں اور کسی سے کسی مسئلے میں اختلاف ہو جانے کا مطلب یہ ہو گیا ہے کہ آدمی پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جائے، یہاں تک کہ اُس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔ اور جو کہیں اختلاف مذہبی نوعیت کا ہو جائے تو پھر اسے جہنّم کے دروازے تک پہنچائے بغیر دم لینا حرام ہے۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جن کے لیے وحدت کا اِتنا بڑا سامان کیا تھا اُن کے لیے اب تفرقے کے سارے دروازے کھل گئے ہیں اور وحدت کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ مسجدیں الگ ہو گئی ہیں۔ ایک مسجد میں دوسرے مسلک کا آدمی نماز پڑھ لے تو وہ جگہ ناپاک ہو جاتی ہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہو۔ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے آدمی سے مصافحہ تک کرنے سے اجتناب کرتا ہے کہ کہیں اس کا ہاتھ گندا نہ ہو جائے۔ انا للّٰہِ وانا الیہ راجعون!

یہ سب کچھ اُسی چیز کا نتیجہ ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مختلف لوگوں نے توحید اور دین و شرع میں نئی نئی چیزوں کی آمیزش کی ہے' اصل دین کے عقائد و احکام میں کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا ہے۔ جو چیزیں اہم نہ تھیں اُنھیں اہم ترین بنایا ہے اور جو اہم تھیں انھیں غیراہم بنا دیا ہے اور پھر انھی آمیزشوں اور اِسی کمی وبیشی کو مدارِ ایمان قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے مختلف گروہ آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوگئے ہیں۔ اس حالت میں ہدایت سے بیگانہ انسانوں کو حق کی دعوت دے کر' اِس عالم گیر برادری میں شامل کرنا تو الگ رہا جو اس برادری میں پہلے سے شامل ہیں خود انھیں بھی اس سے خارج کرنے کا کام کارِثواب سمجھ کر انجام دیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں غیرمسلموں کے لیے ایک تماشا بنا کر رکھ دیا ہے اور مستشرقین کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی ہے کہ یہ اُمت سرے سے کوئی اُمت ہی نہیں ہے۔ اِس وقت اشاعتِ اسلام کی راہ میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو وہ ہماری یہی حالت ہے۔ خدا ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں راہِ راست دکھائے۔ آمین! (عیدالاضحیٰ کے موقع پر تقریر' ۲ دسمبر ۱۹۷۶ء' منصورہ' لاہور)

انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے!

منتخب تقاریر سے ایک مطالعہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ○ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ○ (البلد ۹۰:۴-۵)

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا؟

پیرمحمد کرم شاہؒ

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ انسان کے جسمانی اور رُوحانی دونوں فطری تقاضوں کی تکمیل پر یکساں توجہ مبذول کرتا ہے۔ نہ وہ انسان کو مادی لذتوں میں کھو جانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ اُن سے کلیتاً قطع تعلّق کر کے صرف رُوحانی لطافتوں میں محو ہوجانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سورہ میں اُن اعضا اور جوارح کا ذکر کرنے کے بعد جو انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کے لیے مرحمت فرمائے گئے ہیں' اُسے تنبیہ کی جارہی ہے کہ تجھے عقاب کی قوتِ پرواز دی گئی ہے' اس سے کام لیتے ہوئے تمھارا فرض ہے کہ اخلاقِ حسنہ کی بلندیوں کو سر کرنے کے لیے پرکشار ہو۔ اس مقصد کے لیے جو اعمالِ حسنہ ناگزیر ہیں اُن کا ذکر بھی کر دیا: غلاموں کو آزاد کرنا' قحط سالی کے دنوں میں فاقہ زدہ لوگوں کی خوراک کا اہتمام کرنا' یتیموں اور مسکینوں پر شفقت کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایمان کے چراغ کو روشن رکھنا' خود صبر کرنا اور دوسروں کو صبر اور

ہمدردی کی تلقین کرنا۔ یہ وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی منزل پا لیتا ہے لیکن جو غریبوں کی مادی ضروریات کو استطاعت کے باوجود پورا کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا، وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ (ضیاء القرآن، ج ۵، ص ۵۶۳)

مفتی محمد شفیعؒ

کَبَدٌ کے لفظی معنی محنت و مشقت کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اول عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ابتداے حمل سے رحمِ مادر میں محبوس رہا۔ پھر ولادت کے وقت کی محنت و مشقت برداشت کی، پھر ماں کا دودھ پینے، پھر اُس کے چھوٹنے کی محنت، پھر اپنے معاش اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی مشقت، پھر بڑھاپے کی تکلیفیں، پھر موت، پھر قبر، پھر حشر اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال کی جواب دہی، پھر جزا و سزا۔ یہ سب دَور اُس پر محنتوں ہی کے آتے ہیں، اور یہ محنت و مشقت اگرچہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، سب جانور بھی اس میں شریک ہیں مگر اس حال کو انسان کے لیے بالخصوص اس لیے فرمایا کہ اول تو وہ سب جانوروں سے زیادہ شعور و ادراک رکھتا ہے اور محنت کی تکلیف بھی بقدرِ شعور زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے، آخری اور سب سے بڑی محنت محشر میں دوبارہ زندہ ہو کر عمر بھر کے اعمال کا حساب دینا ہے، وہ دوسرے جانوروں میں نہیں......

بعض علما نے فرمایا کہ کوئی مخلوق اتنی مشقتیں نہیں جھیلتی جتنی انسان برداشت کرتا ہے باوجودیکہ وہ جسم اور جثہ میں اکثر جانوروں کی نسبت ضعیف و کمزور ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ انسان کی دماغی قوت سب سے زیادہ ہے اسی لیے اُس کی تخصیص کی گئی۔ (معارف القرآن، ج ۸، ص ۷۵۰)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اِس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بانسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اِس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں' حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔

ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اِس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف' مشقت' محنت' خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اِس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اُس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اِتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی اگر غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اِس اندیشے سے اُس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتح عالم بھی ہے تو کسی وقت اِس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے' کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن' ج ۶' ص ۳۳۹)

سید قطب شہیدؒ

[اس جدوجہد اور مشقت کی نوعیت کیا ہے؟] ایک شخص اس لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے کہ اُسے زندہ رہنے کے لیے ایک لقمہ اور پہننے کے لیے کپڑے کا ایک ٹکڑا میسر ہو۔ دوسرا شخص اِس لیے جدوجہد کرتا ہے کہ ایک ہزار کے دو ہزار اور ۱۰ ہزار بنائے! ایک اور شخص اقتدار و فرماں روائی

یا جاہ و منصب کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ ایک اور شخص ہے جس کی ساری جدوجہد راہِ خدا میں ہوتی ہے۔ ایک اور شخص ہے جو اپنی خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے مشقتیں جھیلتا ہے۔ ایک اور شخص ہے جو اپنے عقیدے اور اپنی دعوت کے لیے زحمت و مشقت برداشت کرتا ہے۔ ایک شخص دوزخ کی طرف چلتے ہوئے مشقتیں جھیلتا ہے۔ دوسرا جنت کی راہ میں سعی و جہد کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنا بوجھ اٹھاتا اور محنت و مشقت کے ساتھ اپنا راستہ طے کرتا ہوا اپنے رب سے جا ملتا ہے۔ وہاں بدبختوں اور نافرمانوں کے لیے شدید ترین مصائب ہیں اور نیک بختوں اور فرماں برداروں کے لیے عظیم ترین راحت!

زحمت و مشقت دنیوی زندگی کی طبیعت و فطرت ہے۔ البتہ اس کی شکلیں اور اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن انجامِ کار ہے زحمت و مشقت ہی۔ سب سے زیادہ خسارے میں وہ شخص ہے جو حیاتِ دنیا میں زحمتیں اور مشقتیں جھیلتا ہے اور اس کے نتیجے میں آخرت میں ان سے زیادہ تلخ اور شدید مصائب و شدائد سے دوچار ہوتا ہے، اور کامیاب ترین انسان وہ ہے جو اپنے رب کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے تاکہ جب اس کے پاس پہنچے تو وہ زندگی کی مشقتوں سے محفوظ ہو جائے اور اللہ کے سائے میں عظیم ترین راحت سے ہم کنار ہو۔

آخرت کی اِس جزا کے علاوہ مختلف قسم کی کوششوں اور مشقتوں پر دنیا میں بھی کچھ جزا مترتب ہوتی ہے۔ جو شخص کسی عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرتا ہے اُس کی طرح وہ شخص نہیں ہوسکتا جو کسی پست اور حقیر مقصد کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ دل کی طمانیت اور جان و مال کی قربانی پر راحت و سکون محسوس کرنے میں دونوں شخص برابر نہیں ہوسکتے۔ جو شخص زمین کے بندھنوں سے آزاد ہو کر جدوجہد کرتا ہے یا اِس لیے جدوجہد کرتا ہے کہ زمینی بندھنوں سے آزاد ہو، اُس کی طرح وہ شخص کبھی نہیں ہوسکتا جو حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین سے چمٹتا اور زمین کی دلدل میں دھنسنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ جو شخص دعوت کی راہ میں جان دیتا ہے اُس کی مانند وہ شخص نہیں ہوسکتا جو اپنی نفسانی خواہشات کے لیے جان دیتا ہے۔ دونوں اپنی جدوجہد کے شعور اور اِن مشقتوں کے سلسلے میں جو وہ برداشت کرتے ہیں، یکساں نہیں ہوسکتے۔

(فی ظلال القرآن، ترجمہ: سید حامد علی، ۳۰ واں پارہ، ص ۲۵۴-۲۵۵)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

لفظ اِنْسَانْ اگر چہ عام ہے اور اس کے عام ہونے کے کئی فائدے ہیں لیکن یہاں اس عام سے مراد خاص طور پر قرآن کے اولین مخاطب بنی اسماعیل بالخصوص قریش ہیں۔ سرزمین حرم میں ان کے بزرگ اجداد کی آمد اور سکونت اور ان کی ذریت کی ابتدائی تاریخ کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آج اس سرزمین میں تم کو جو فراخیٔ رزق و رفاہیت حاصل ہے یہ نہ سمجھو کہ یہی حال ہمیشہ سے رہا ہے یا یہ حالت تمھاری ذہانت و قابلیت کی بدولت ہوئی ہے۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا ہے، اس وقت یہ علاقہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاہ اور غیر مامون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی خانہ بدوشانہ اور نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا اور ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے گلے کی حفاظت کا ذمہ دار خود تھا۔ لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی نظامِ عدل اور قانون موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا تو ان کے اور ان کی اولاد کے لیے یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس وادی غیر ذی زرع میں ان کو رزق و فضل سے بھی بہرہ مند فرمائے اور امن سے بھی متمتع رکھے۔ یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ رزق کے دروازے بھی کھلے اور بیت اللہ کی تولیت اور اشہرِ حرم کی امن بخشی کی بدولت سفر اور تجارت کی راہیں بھی فراخ ہوئیں جس سے ان کی معاشی حالت مشقت کی جگہ رفاہیت و خوش حالی میں تبدیل ہوگئی۔ یہاں تک کہ آج تم اس کے غرور میں نہ خدا کو خاطر میں لا رہے ہو نہ اس کے رسول کو بلکہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے، تم اس میں ہر قسم کے تصرف کے مجاز ہو، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ تمھارے اس عیش اور اس آزادی میں خلل انداز ہو سکے۔

قریش کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ حرم کی اس تاریخ کی یاددہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر طغیان میں مبتلا ہوگئے تو یاد رکھیں کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے......

مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آج قریش کو جو مال و جاہ اور جو سطوت و اقتدار بھی حاصل ہے، اس میں نہ ان کی ذاتی سعی و تدبیر کو کوئی دخل ہے اور نہ ان کے

خاندانی استحقاق کو بلکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت ہے جس سے وہ بہرہ مند ہو رہے ہیں' اور یہ برکت ان کے لیے غیر مشروط نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی' بیت اللہ کے مقصد کی تکمیل اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے رسول پر ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ ان شرطوں کے پابند رہیں گے تو ان کو یہ عزت و سرفرازی حاصل رہے گی ورنہ یہ سب چھن جائے گی۔ [اُمت مسلمہ اُمت وسط ہے' اس کی سربلندی کے لیے بھی یہی مطالبہ ہے]۔ (تدبر قرآن' ج ۸' ص ۳۷۰-۳۷۲)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

(اس مشقت کا مقتضا یہ تھا کہ اس میں احساس' عجز و درماندگی اور زیادہ پیدا ہوتا رہتا) مراد یہ ہے کہ انسان کی ساخت و ترکیب ہی ایسی رکھ دی گئی ہے کہ اسے ساری عمر دقتوں کا' اور کسی نہ کسی اعتبار سے مصیبتوں ہی کا سامنا رہے۔ آج دوکان ٹوٹ گئی' کل کاروبار بیٹھ گیا۔ آج فلاں دشمن ستا رہا ہے' کل فلاں مرض نے آ دبایا۔ کبھی خود بیمار' کبھی بیوی بچہ بیمار۔ کبھی اس عزیز کی موت کا صدمہ' کبھی اس دوست کی بے وفائی کا رنج۔ ساری عمر غم و صدمات ہی کے اُلٹ پھیر میں گزر جاتی ہے اور انسان کو اپنے عجز و بے بسی کا مشاہدہ قدم قدم پر ہوتا رہتا ہے۔ اس سے طبیعت میں قدرتاً شکستگی پیدا ہونی چاہیے' اور خودی و خود بینی کو تو پاس بھی نہ پھٹکنا چاہیے۔ لیکن کافر ان سارے واقعات سے مطلق سبق نہیں لیتا۔ مومن کو تو ہر شے میں حکمت الٰہی کی جھلک نظر آ جاتی ہے' اور وہ ربوبیت مطلقہ پر اعتماد و اطمینان رکھ لیتا ہے۔ لیکن کافر کو دماغی الجھن اور قلبی ادھیڑ بُن سے کسی حال میں مفر نہیں' اور نہ اُس کی حرص و ہوس کی آگ کبھی بھی بجھتی ہے۔ الْاِنْسَانَ' انسان سے یہاں بھی مراد کافر' ناشکرا انسان ہے جسے زندگی کے کسی پہلو میں بھی چین نہیں۔ (تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادی' ص ۱۱۹۵)

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ (۹۰:۵)

کیا اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا؟

مفتی محمد شفیعؒ

انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمھاری جو یہ خواہش ہے کہ دنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے، کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، یہ خیال خام ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر شخص کو دُنیا میں محنت و مشقت اور رنج و مصیبت پیش آئے، اور جب مشقت وکلفت پیش آنا ہی ہے تو عقل مند کا کام یہ ہے کہ یہ محنت و مشقت اُس چیز کے لیے کرے جو اس کو ہمیشہ کام آئے اور دائمی راحت کا سامان بنے اور وہ صرف ایمان اور طاعت حق میں منحصر ہے۔ آگے غافل اور آخرت کے منکر انسان کی چند جاہلانہ خصلتوں کا ذکر کر کے فرمایا: اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَہٗٓ اَحَدٌ، یعنی کیا یہ بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے اعمالِ بد کو کسی نے دیکھا نہیں، اس کو جاننا چاہیے کہ اس کا خالق اُس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ (معارفِ القرآن، ج ۸، ص ۷۵۰)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

یعنی کیا یہ انسان جو اِن حالات میں گھرا ہوا ہے، اِس غرے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے، کوئی بالاتر اقتدار اُس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اِس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بوتا رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پلٹا بڑے سے بڑے با اقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ عروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں ذلیل وخوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اِس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی کا اس پر بس نہیں چل سکتا؟ (تفہیم القرآن، ج ۶، ص ۳۳۹-۳۴۰)۔ (ترتیب: امجد عباسی)

موصولہ مضامین کی ایک جھلک

مصنف	مضمون
مولانا محمد چراغؒ	ایک عہد آفرین عالم' کشادہ دل رہنما
پروفیسر غلام اعظم	اسلام کا سیاسی نظامِ فکر اور مولانا مودودیؒ
نوابزادہ نصراللہ خانؒ	حرفِ حق کہنے کی جرأت دے گیا
آیت اللہ محمد علی ایازی	عصری و عمرانی تفسیر' تفہیم القرآن
ڈاکٹر مالک بدری	چند یادداشتوں کا خراجِ تحسین
صلاح الدین عتبانی	مولانا مودودیؒ' مستقبل گر رہنما
ڈاکٹر فتحی یکن	روشن خیالی کا عالمی اسلوب اور سید مودودیؒ
ڈاکٹر محمد عمارہ	سید مودودیؒ' ایک محسن اور رہنما
ڈاکٹر مصطفیٰ طحان	امام ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ڈاکٹر عبدالمغنی	غیر مسلم معاشرے میں رہنمائی
حامد عبدالرحمٰن الکاف	مولانا مودودیؒ کے شخصی عناصر ترکیبی
پروفیسر سید عبدالباری	فکر و عمل کے چند گوشے
شائستہ فخری	مغرب' مسلمان عورت اور مولانا مودودیؒ
فرزانہ چیمہ	دینی معاشرت کی ایک پکار
مولانا سید وصی مظہر ندوی	فرزانگی کے لاکھ سوالوں کا اِک جواب
فضل معبود	پشتو میں مولانا مودودیؒ کی کتب
حافظ محمد ادریس	براعظم افریقہ میں مولانا مودودیؒ کے تراجم
ثروت جمال اصمعی	معاشرے میں تبدیلی کا وژن
ڈاکٹر حسن صہیب مراد	مولانا مودودیؒ کا تنظیمی کارنامہ
الیف الدین ترابی	مسئلہ کشمیر اور مولانا مودودیؒ
نیک محمد نقش بندی	سندھی میں مولانا مودودیؒ کی کتب
عنایت علی خاں	قیمتی یادوں کا مجموعہ
پروفیسر عبدالجبار شاکر	سیرت نگاری اور مولانا مودودیؒ
الیف الدین ترابی	سید مودودیؒ کا تفسیری اسلوب
محمد رفیق چودھری	مسائل کی تشریح کا اسلوب
ضیاء الدین فلاحی	فقہی تحریروں کا ایک پہلو
ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	عورت کے خانگی حقوق اور مولانا مودودیؒ
ڈاکٹر فضل الٰہی قریشی	بلوچستان قانون کمیشن اور مولانا مودودیؒ
عبدالرشید عراقی	مردِ مومن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

_____ کے علاوہ مزید فکر انگیز مضامین اور یادداشتیں

ماہنامہ

ترجمان القرآن

بہ یاد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعت خاص

۲

ان شاء اللہ

مارچ اپریل ۲۰۰۴ء

کا مشترکہ شمارہ

ہوگا

مکتوبات بنام:

حسن الزمان اختر' ساجد حسین'

حفیظ الرحمٰن و غیرہ

اُمت کے لیے

مستقبل کا لائحہ عمل

بین الاقوامی کانفرنس کا اعلامیہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی صدسالہ تقریبات کے موقع پر جماعت اسلامی پاکستان کی دعوت پر ''احیاے اسلام اور اُمت مسلمہ'' کے عنوان سے ایک دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس ۶-۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کو لاہور کے ایوانِ اقبال میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں قطر' اُردن' لبنان' مصر' فلسطین' مراکش' ایران' کویت' سوڈان' نیپال' تیونس' بنگلہ دیش' ملائیشیا اور امریکہ سے اسلامی تحریک کے قائدین' مفکرین اور دانش وروں نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک ۲۲ نکاتی اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں مستقبل کی حکمتِ عملی کے اہم نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہم اس اعلامیے کا مکمل متن قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

۱- سب سے زیادہ اہم بات اور اُمت کے کرنے کا اولین کام یہ ہے کہ ہر سطح پر مسلمان قرآن وسنت کی تعلیمات سے بخوبی آگاہ ہوں اور اس بات کا عزم صمیم کریں کہ وہ اپنی انفرادی' اجتماعی اور قومی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کریں گے۔ اسلامی تعلیمات کو عام کرنا' اس پر عمل کرنا اور کرانا ان کی زندگیوں کا اہم ترین مقصد قرار پائے۔

۲- طاغوت اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مسلمانوں' اسلام اور اسلامی تحریکوں بحیثیت مجموعی پوری انسانیت پر حملہ آور ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ اسلامی تحریکوں پر بے بنیاد الزامات لگا کر انھیں بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اس نے دینی مدارس اور علما کے خلاف زبردست پروپیگنڈے کا بازار گرم کر رکھا ہے تاکہ دینی مدارس اور

علما دونوں کے خلاف اقدامات کرنے کا جواز پیدا ہو جائے۔ اسی طرح نفاذ شریعت کے لیے سرگرم دینی عناصر زیرعتاب ہیں۔ دوسری جانب یہی قوتیں اخلاقی بے راہ روی، عریانی، بے حیائی اور اخلاقی فساد پھیلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ طاغوت بدی کو فروغ دینے اور نیکی کو مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اُمت مسلمہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ خود کو اور انسانیت کو طاغوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ کرنے کے لیے منظم اور متحد ہو کر اسوۂ حسنہؐ کی روشنی میں پرامن اور مؤثر جدوجہد کرنے پر کمربستہ ہو جائے تاکہ دنیا کو تباہی سے بچایا جاسکے۔ نیز ظلم کے خاتمے، انصاف کے قیام اور آزادی کے حصول کے لیے تمام تر جدوجہد اسلامی احکامات کے مطابق اور پرتشدد اور خفیہ سرگرمیوں سے پاک ہو اور اس میں انتقام اور دہشت گردی کا کوئی شائبہ بھی نہ پایا جائے۔

۳- اسلام دشمن قوتیں باہم یک جا ہو کر اُمت مسلمہ پر حملہ آور ہیں۔ ان حالات میں اتحاد بین المسلمین وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تمام فروعی اختلافات کو ختم کر کے پوری دنیا کے مسلمان متحد ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنادیں۔

۴- درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ مسلم دنیا میں تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے۔ اپنے ایجنڈے میں تعلیم کو اولیت دی جائے۔ اپنی تہذیبی اقدار کا تحفظ کیا جائے اور جہالت اور جاہلانہ رسوم کا خاتمہ کیا جائے۔ علماے حق اور اسلامی مفکرین کے تعاون سے مثالی تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور موجودہ تعلیمی اداروں کو بہتر بنایا جائے۔

۵- آزاد مسلم ممالک میں اسلامی شریعت کو عملاً نافذ کیا جائے تاکہ عدل، انصاف، مساوات اور امن و امان کا دور دورہ ہو اور مسلم ممالک پوری دنیا کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بن سکیں۔

۶- اسلامی احکام اور شعائر کے مطابق اجتہاد اور جہاد کی ذمہ داریاں پوری احتیاط اور اسلامی آداب کے مطابق ادا کی جائیں۔ اگر اجتہاد فکری زندگی اور تابندگی کے لیے ضروری ہے تو جہاد انسانی زندگی کو عدل اور انصاف کے مطابق استوار کرنے کا ذریعہ ہے۔ جہاد کو طاغوت نے اپنے مذموم پروپیگنڈے سے دہشت گردی کا جو نام دیا ہے، کانفرنس اسے مسترد کرتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ جہاد، ظلم اور استعماری قبضے کے خاتمے اور عدل کے قیام کا

ذریعہ ہے۔ یہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس پر کوئی پابندی قبول نہیں کی جاسکتی۔

۷- اُمت کے تمام مکاتب فکر میں اتفاق‘ اتحاد‘ یگانگت‘ برداشت‘ تحمل اور وسعت نظر کے اصولوں کو اپنایا جائے۔ اختلاف رائے کو علمی سطح تک محدود رکھا جائے۔ دشمن کی سازشوں کا ادراک کرتے ہوئے اس کو اس بات کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کو مسلک کے اختلاف کے نام پر باہم لڑادے۔

۸- اُمت مسلمہ کو ائمہ کفر کے برپا کیے ہوئے فتنوں اور خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کی جائے۔ یہ عناصر متحد ہو کر اُمت مسلمہ کو اپنی چیرہ دستیوں کا ہدف بنا رہے ہیں۔ ان کی کھلی اور چھپی سازشوں کو طشت از بام کیا جائے۔

۹- ملت کے اجتماعی و سیاسی معاملات اور قومی قیادت کے نصب وعزل کے لیے انتخابات کا منصفانہ جمہوری طریقہ اپنایا جائے۔ اسلام شورائیت کا قائل اور آمریت کا شدید مخالف ہے‘ اس لیے تمام معاملات‘ مشاورت کے ذریعے طے کیے جائیں۔ آمریت اور استعمار کی حاشیہ بردار قیادتوں کے طرزعمل سے ملت کو نجات دلائی جائے تاکہ اجتماعی زندگی کا نظام آزادی‘ جمہوری اور شورائی اصولوں کے مطابق پروان چڑھ سکے۔

۱۰- ملت اسلامیہ کو اس کے قومی‘ معدنی‘ زرعی اور خام وسائل پر استعماری قوتوں کی روز افزوں اجارہ داری سے نجات دلانے اور حکمرانوں کو دشمنوں کا آلہ کار بننے سے روکنے کے لیے افہام و تفہیم اور ابلاغ عامہ کے تمام مؤثر ذرائع استعمال کیے جائیں۔

۱۱- ملی وسائل کی ظالمانہ تقسیم کے موجودہ نظام کے خاتمے اور چند مراعات یافتہ طبقات کی اجارہ داری سے نکال کر امانت و دیانت کے ساتھ اُمت کی بہبود اور اس کے وسیع تر مفاد میں خرچ کرنے کے منصوبے بنائے جائیں تاکہ غربت کا خاتمہ ہو سکے اور ملت اسلامیہ حقیقی اور دیرپا معاشی اور معاشرتی ترقی حاصل کر سکے اور مظلوم انسانوں کو ان کے حقوق مل سکیں۔

۱۲- اس حقیقت کو واشگاف کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کیا جائے کہ اسلام کسی تہذیبی تصادم کا نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان پرامن بقاے باہمی کا علم بردار ہے۔ اسلام انسانی مساوات‘ حقوق کے تحفظ اور احترام آدمیت اور مذہب کی آزادی کا دین ہے۔ تہذیبوں

کے درمیان تصادم کا نعرہ مغربی دنیا نے متعارف کرایا ہے جو ایک خطرناک رجحان ہے۔ یہ نفرت پر مبنی نعرہ ہے جسے ہم مسترد کرتے ہیں۔ ہم اس بات کے حامی ہیں کہ مختلف ادیان اور تہذیبوں کے درمیان معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ مکالمے اور گفت و شنید کے ذریعے طے پائیں تاکہ دنیا امن کا گہوارہ بن سکے۔

۱۳- عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کے پرکشش نام پر استعمار پوری دنیا کو اپنے معاشی اور تہذیبی شکنجے میں جکڑنے کے لیے پوری شدت کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ ملت کو اس خطرے سے آگاہ کیا جائے تاکہ متحد اور منظم ہو کر خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔

۱۴- ملت اسلامیہ اپنی موجودہ سیاسی' معاشی' اقتصادی اور تعلیمی پستی میں استعماری طاقتوں کے رول اور ریشہ دوانیوں کے پورے شعور اور احساس کے ساتھ اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری صرف استعماری قوتوں پر ڈالنے کے بجائے حقیقت پسندی کے ساتھ خود بھی اپنی کارکردگی کا جائزہ لے کر اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی اصلاح کرے۔ داخلی خرابیوں پر قابو پائے بغیر خارجی دشمن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۵- کشمیر' فلسطین' افغانستان' عراق' شیشان' مشرقی یورپ' اراکان اور مورولینڈ کے مظلوم مسلمانوں اور دیگر مظلوم اور محکوم اقوام کے حق خود مختاری کو تسلیم کرانے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کے لیے اپنا پورا وزن ڈالا جائے۔

۱۶- اعلیٰ تعلیم، تحقیق' سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کو اولیت دی جائے اور اس بات کا بطور خاص اہتمام کیا جائے کہ طلبہ میں جدید علوم میں تحقیق کے ساتھ دینی روح اور جہادی جذبہ پیدا ہو۔

۱۷- مشنری تنظیموں اور بیرونی این جی اوز کے تحت براہِ راست یا بالواسطہ چلنے والے تعلیمی اداروں پر کڑی نظر رکھی جائے تاکہ وہ ہماری نئی نسل کو اپنے رنگ میں رنگ کر اُمت مسلمہ کے خلاف استعمال نہ کرسکیں۔ مغربی قوتیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے مسلمانوں کے قائم کیے ہوئے رفاہی اور خیراتی اداروں کو تنقید کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر بہت سے مفید اداروں کو کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ اس طرزِ عمل کی اصلاح کی جائے۔

۱۸- بیرونی امداد پر سرگرم عمل نام نہاد این جی اوز کا احتساب بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان کا اصل ہدف ہمارے خاندانی نظام کی تخریب' تہذیبی اقدار سے انحراف اور ایمان کی بنیادوں کو تشکیک کا نشانہ بنانا ہے۔ یہ تنظیمیں استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلم دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے مذموم مقاصد کو ناکام بنانے کے لیے اہل دانش تمام وسائل بروے کار لاکر اپنا مذہبی اور ملّی فرض ادا کریں۔

۱۹- اُمت مسلمہ کے عالمی مسائل پر مضبوط آواز اٹھانے کے لیے او آئی سی کو نہ صرف فعال بنایا جائے بلکہ میڈیا' تجارت' تعلیم' صنعت اور دفاع کے شعبوں میں مشترکہ مؤقف اور پالیسیاں اپنائی جائیں تاکہ اُمت مسلمہ اپنا عالمی کردار ادا کرے اور کشمیر' فلسطین' شیشان' اراکان' مورولینڈ وغیرہ کے مظلوم مسلمانوں کو استعمار کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے اُمت مسلمہ تعمیری کردار ادا کرسکے۔

۲۰- ابلاغ عامہ کی تمام اصناف ریڈیو' ٹیلی ویژن' انٹرنیٹ' اخبارات و جرائد ایک بہت بڑی قوت ہیں۔ ان کو انسانوں کی اصلاح' امن عامہ' محبت و اخوت اور اسلام کے پیغام کی تشہیر اور ملت کے مفاد میں استعمال کرنے کے منصوبے بنائے جائیں۔ اس وقت یہ قوت بڑی حد تک بدامنی کے فروغ' بے حیائی اور عریانی عام کرنے اور تشدد کا پرچار کرنے کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔ اس کا تدارک ضروری ہے۔

۲۱- اسلام نے خواتین کو جو حقوق' احترام کا مقام اور تحفظ عطا کیا ہے اسے اجتماعی زندگی میں پوری دیانت داری کے ساتھ بروے کار لایا جائے۔ عورتوں کی حق تلفی کے رواجی اور جاہلانہ طریقوں اور رسومات کا خاتمہ کیا جائے جن کی اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ سیکولر عناصر عورتوں کے حقوق کے معاملے کو اسلامی احکام کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کا موقع نہ دیا جائے۔

۲۲- ملت اسلامیہ کے وہ لوگ جو معلومات کی کمی یا کسی غلط فہمی کے باعث ایسی راہوں پر چل پڑے ہیں جن کا نقصان اُمت کو اور فائدہ استعماری قوتوں کو پہنچ رہا ہے' انھیں چاہیے کہ وہ کھلے دماغ کے ساتھ اپنی روش پر نظر ثانی کریں اور دشمن کی تقویت کا ذریعہ بننے کے

بجاے اُمت کے ساتھ تعاون اور اس کی تقویت کی راہ اپنائیں۔

یہ کانفرنس اپنے اس پختہ یقین کا اظہار کرتی ہے کہ طاغوتی قوتیں اپنے وسائل' عسکری قوت اور مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود ناکام اور نامراد ہوں گی اور ان شاء اللہ باطل مغلوب اور حق غالب ہوگا اور اسلام کا آفاقی' عادلانہ اور منصفانہ نظام مظلوموں کو ظلم سے نجات دلائے گا اور اللہ کا کلمہ سربلند ہوگا۔ ان شاء اللہ!

یہ کانفرنس جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اور منتظمین کی شکرگزار ہے کہ ایسے نازک مرحلے اور موڑ پر ایک طویل عرصے کے بعد دنیاے اسلام کے چیدہ اور منفرد علما' رہنماؤں اور دانش وروں کو مل بیٹھنے' اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ کانفرنس کو توقع ہے کہ اس کی جانب سے جاری کیا جانے والا یہ متفقہ اعلامیہ دنیاے اسلام کے لیے ایک بروقت پیغام ثابت ہوگا جس کے ان شاء اللہ مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ باہمی ملاقاتوں' تبادلہ خیال اور تعاون کا یہ سلسلہ مزید جاری رہے گا۔

نصیحت و خیرخواہی

ولید شبلی

ترجمہ: خدا بخش کلیار

باہم نصیحت (تواصی) دعوت دین کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے اور سب سے زیادہ حساس بھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اُمت مسلمہ کے مقصد وجود سے مشروط ہے۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (اٰل عمران ۳:۱۱۰) ''تم اس دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ چنانچہ اس کے اس مقام و منزلت کی بنا پر اس کو فریضہ اقامت دین میں سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا جہاں اس سے صحیح کام لیا گیا' وہاں دعوت کا عمل مؤثر انداز میں آگے بڑھا اور وہ بارآور بھی ہوا' اور جہاں اس سے پہلوتہی کی گئی وہاں معاملہ اس کے برعکس رہا۔

اھمیت

اس کی اہمیت زندگی کے مختلف دائروں' حکومت' فوج' میدانِ سیاست اور ایسے ہی دیگر میدانوں سے مربوط ہونے کی بنا پر دوچند ہے۔ لہٰذا نصیحت اور خیرخواہی کے عمل کا صحیح فہم و ادراک ہمارے لیے بے حد ضروری ہے تاکہ حق کی نصیحت اور دعوت الی الخیر کا فریضہ

بہ طریق احسن انجام دیا جاسکے۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دعوت کے منافی ہر موقع سے بچتے ہوئے کیسے ہم ایک دوسرے کو مؤثر نصیحت کریں؟ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس موقع پر نصیحت واجب ہے اور کہاں اس کی پذیرائی ہوگی، کون سا اسلوب سب سے مؤثر ہے، اور اس کے لیے کون سا وقت مناسب ہے اور دعوت کے عمل پر اس کے مثبت یا منفی اثرات کس حد تک ہوں گے۔

اسلام میں ایک دوسرے کو نصیحت اور حق کی تلقین کوئی نفلی کام نہیں ہے بلکہ وہ شرعی، دعوتی اور تحریکی کام کا ایک اہم عنصر ہے۔ ابن ماجہ نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے، آپؐ نے اللہ کی حمد وثنا کی اور فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو، اس سے قبل کہ تم دعا کرو اور میں قبول نہ کروں، تم سوال کرو جسے میں پورا نہ کروں اور تم مجھ سے مدد مانگو اور میں تمھاری مدد نہ کروں''۔

دعوت کے لحاظ سے اسلام نے اسے فرد کی ذمہ داری قرار دیا ہے کہ جب بھی اِس کا موقع میسر آئے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ آگے بڑھے، نصیحت کرے، اور خود بھی نصیحت کو قبول کرے اور بھلائی پر مشتمل اپنی رائے کا اظہار کرے۔ یہ ایک عظیم اصول ہے۔ نصیحت کو کسی ایک گروہ تک محدود نہ رکھا جائے کیوں کہ نصیحت سے تو کوئی بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اللہ کا فرمان ہے: وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ (العصر ۱۰۳:۱-۳) زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

کسی بھی دعوت کی نشوونما اور اس کا موسم بہار بلکہ اس کی بقا کئی ایک عوامل کی مرہونِ منت ہوتی ہے، اور ان میں سے ایک اہم عمل ایک دوسرے کو نصیحت ہے۔ جب باہمی نصیحت ایک صحت مند دائرے میں دی جائے، اسے مطعون نہ کیا جائے، اور اسے نظامِ غالب سے خروج کی کوئی قسم نہ سمجھا جائے، اور وہ جاری رہے تو کام فروغ پائے گا، برگ و بار لائے گا اور اسے اکھاڑ

پھینکنا مشکل ہوگا۔

ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب وہ کسی فرد میں' جماعت میں، نظام میں یا ریاست میں کوئی عیب یا انحراف دیکھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل میں حقِ وصیت ادا کرے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (اٰل عمران ۳:۱۰۴) ''تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے''۔

ایک بیدار مغز قیادت کا فرض ہے کہ دعوت کے کسی بھی عمل میں نصیحت کو قبول کرے۔ وہ قرآن سے آئے، تنقید سے آئے یا ادراکِ زمانہ سے۔ اس پر لازم ہے کہ مخالف آرا کو مناسب مقام دے، ان کی قدر کرے اور خواہ وہ کیسی ہی ہوں انھیں احمقانہ قرار نہ دے۔ اختلاف کے باوجود دوسری رائے کا قبول کرنا' اور اس کا احترام، کام کے فروغ اور اس کے استقرار کے عوامل میں سے ایک اہم عمل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی غیبی اشارہ اور متعلقہ مسئلے کے لیے کوئی رہنمائی اس ذات کی طرف سے ہو' جس کے ہاتھ میں عمل کا نتیجہ ہے۔ ہر تنقید نقصان دہ یا معیوب نہیں ہوتی۔ دوسری رائے کو سننا، اسے اپنانا اور اس میں موجود خیر کو اخذ کرنا' مسلمان کے لیے اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔

دوسری رائے کو نہ سننا اور اس کے مفید پہلو کو قبول نہ کرنا' رائے کو روک دینے کی ایک صورت ہے۔ قساوت قلبی کے یہی معنی ہیں۔ یہ عقل کی گمراہی پر منتج ہوسکتا ہے۔ جب اصحابِ فہم و فراست میں سے آخری فرد گمراہ ہو جائے تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس سے کس قدر نا انصافی اور انحراف واقع ہوگا۔ لہٰذا ہر فرد پر باہمی نصیحت کو اپنانا لازم ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں، اپنی شخصیت میں اور اپنی سرگرمی میں اپنا رجوع دعوت و شریعت کی طرف رکھے۔

وہ قیادت جو فکری راہ نمائی کے منصب پر فائز ہو' اس پر لازم ہے کہ وہ نصیحت، تنقید اور اداروں کی طرف سے اختلافِ رائے کی حوصلہ افزائی کرے اور دعوت کے حوالے سے جملہ قوتوں سے استفادہ کرے۔ وہ کسی ایک کو بھی اظہار سے نہ روکے، خواہ اس کی کوئی بھی

رائے ہو۔ اس کا شعار یہ ہو کہ ''تمھارے اندر کوئی بھلائی نہیں اگر تم یہ بات (بطور نصیحت یا تنقید) نہ کہو، اور ہمارے اندر کوئی بھلائی نہیں اگر ہم اسے نہ سنیں''۔ (قول حضرت عمرؓ)

پس ہوش مند قیادت پر واجب ہے کہ وہ باہمی نصیحت کو اس کا اصل مقام دے، اسے اپنے افراد کے دلوں میں پختہ کرے، اور اس بارے میں ان کی تربیت کرتی رہے۔ قیادت اور افراد کو باہم اس طرح مربوط ہونا چاہیے جس طرح کہ اعصاب جسم کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں تو جسم مفلوج ہو جاتا ہے۔

شرائط و آداب

نصیحت و خیر خواہی کے لیے متعدد شرائط ہیں جنھیں ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

درست نیت: ہر نصیحت کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ بطریق احسن نصیحت کرے اور جسے نصیحت کی جائے وہ اسے بطریق احسن قبول کرے۔ نصیحت صرف اور صرف اللہ وحدہ کے لیے ہو اور اس میں کسی دنیوی غرض کی ملاوٹ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ○ (الکہف ۱۸:۱۱۰) ''پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے''۔ لہٰذا نصیحت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کیا جائے اور اچھے پہلو کو ہی پیش نظر رکھا جائے، نیت پر شک نہ کیا جائے۔

خلوصِ نیت: جو شخص نصیحت کرے اسے چاہیے کہ وہ خلوصِ نیت کو بدرجہِ اتم ملحوظ رکھے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد گرامی ہے: ''یہ بڑی خیانت ہے کہ تو اپنے بھائی سے ایسی بات کرے جسے وہ سچ سمجھے، جب کہ تو نے اس کے ساتھ جھوٹ بولا ہو''۔ جب مسلمان کی پوری زندگی سراپا صدق و دیانت ہے تو نصیحت کی حالت میں تو سچائی واجب تر ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ صحیح ہے تو اس میں خیر کثیر ہے، اور اگر وہ جھوٹ اور دھوکے پر مبنی ہے تو یہ باعثِ فساد بھی ہے اور خیانت کی ایک شکل بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔!

مؤثر دعوت: سلف کا قول ہے: ''کامل ترین اسلوب کے ساتھ نصیحت کرو، اور

نصیحت کسی بھی اسلوب میں ہو اسے قبول کرلو''۔ لہٰذا نصیحت کے لیے بڑا مثالی اسلوب اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ وہ علیحدگی میں ہو' نرمی و خیرخواہی کے ساتھ ہو' اوراس میں احساسِ برتری کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)''پیغمبرؐ! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعاے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، کہ جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں''۔

حقیقت پسندی: یہ ناگزیر ہے کہ ہماری نصیحت مبنی بر حقیقت ہو۔ کسی معمولی بات کو نہ تو ہم اہم بنا کر پیش کریں اور نہ کسی اہم بات کو غیر اہم۔ معاملے کی اہمیّت کا اندازہ اس کے تناسب سے ہی لگائیں۔ ہمیں اسے پیش کرنے ، یا اس کی تردید کرنے میں انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی سے اجتناب کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہماری نظر میں رہے: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ صلے وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (الشوریٰ ۴۲:۱۰)''تمھارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اس کی طرف میں رجوع کرتا ہوں''۔

کھلے دل سے قبولیت: جب تک نصیحت کا معاملہ شریعت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے دائرے میں ہو، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے شرح صدر کے ساتھ قبول کریں اور سیدنا عمرؓ کا اتباع کریں۔ انھوں نے فرمایا: ''لوگوں میں سے سب سے زیادہ میرا پسندیدہ وہ شخص ہے جو میرے عیب مجھے تحفے میں بھیجے''۔

امام شافعیؒ نے فرمایا: ''میں نے کبھی کسی سے اس خواہش کے ساتھ بحث نہیں کی کہ اس

سے کوئی غلطی سرزد ہو اور میں نے کبھی کسی سے گفتگو نہیں کی مگر یہ چاہتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ میری اور اس کی زبان پر حق کو ظاہر فرما دے۔ اور میں نے کبھی کسی پر حق اور حجت وارد نہیں کی اور اس نے مجھ سے اسے قبول کر لیا ہو' مگر یہ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے اور میں اسے محبوب ہوں۔ اور جب بھی کبھی کسی نے حق کے معاملے میں مجھے بڑا سمجھا تو وہ میری نظروں سے گر گیا اور میں نے اسے دھتکار دیا۔ مجھے یہ بات محبوب ہے کہ لوگ میرے علم سے فائدہ اٹھائیں اس کے بغیر کہ اس میں سے کچھ بھی میری طرف منسوب کیا جائے''۔

اثرات و نتائج

جب ایک دوسرے کو نصیحت کی ادایگی صحیح طریقے اور مذکورہ امور کا خیال رکھ کر کی جائے گی تو اس سے عمدہ نتائج برآمد ہوں گے۔ ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

کام کا فروغ اور اہداف کا حصول: وہ عمل جو نصیحت و خیر خواہی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا وہ بہتر اہداف حاصل کرے گا اور زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ یہ اس لیے کہ تمام کے تمام افراد دعوت کے میدان میں ایک شخص کے دل کی طرح ہوتے ہیں اور ان کے مابین مادی یا نفسانی پردے حائل نہیں ہوتے۔

بہتر فیصلے تک رسائی: باہمی نصیحت کے نتیجے میں کسی بھی مسئلے کے بارے میں قیادت کے سامنے مختلف آرا کے سامنے آنے سے کسی بھی پالیسی یا نقطۂ نظر کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں جس سے کسی بہتر فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مختلف افراد کی رائے سامنے آنے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوتا ہے کہ ہر فرد اپنا کارِ منصبی اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے ماہرانہ مشوروں سے اپنی قیادت کے نظم و نسق کے تحت اور اس کی مدد کے ساتھ اپنی ہمہ پہلو صلاحیت کو بروے کار لاتے ہوئے عمل کرتا ہے اور قیادت کی صحیح اور مناسب فیصلہ کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

اگر کسی وجہ سے کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہو جائے لیکن اگر افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کو جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ حق بات کی نصیحت اور صبر کی تلقین کی روح رائج ہو' اور

معاملات میں صدق و دیانت اور شفافیت مقصود ہو تو اختلاف رائے کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے' تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ مخالفانہ رائے کو نہ دبایا جائے بلکہ نقطۂ نظر کو جانا جائے۔ البتہ اس کا اہتمام ہو کہ چھوٹا بڑے کا احترام کرے اور بڑا چھوٹے سے شفقت کا مظاہرہ کرے' اور جب مسئلے کی کوئی راہ نکل آئے تو پھر اس پر شرح صدر ہونا چاہیے۔ دوبارہ اسے اچھالا نہیں جانا چاہیے' اور اختلاف کو وہیں دفن کر کے متفقہ فیصلے کو لے کر چلنا چاہیے۔ اس طرح سے اختلافی مسائل کا بخوبی احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

روح رفاقت کو تقویت: جب ہر فرد کے پیش نظر اللہ کی رضا کا حصول ہو' اور افراد اور قیادت کے مابین خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہو' اور ہر فرد اپنے دل کی بات بلا تردد کہہ سکے، جب کہ اس کو خدا کا خوف بھی دامن گیر ہو تو ایسی صورت میں ہر ایک کو اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہوگا۔ ہوش مند قیادت اپنے افراد میں روحِ رفاقت کو فروغ دیتی ہے اور اپنے اور کارکنوں کے درمیان کسی بھی نوعیت کے فاصلے پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یہ روحِ رفاقت نصیحت و خیر خواہی سے ہی پروان چڑھتی ہے۔

اخوت و یک جہتی کا فروغ: جب باہم نصیحت کے عمل کے ساتھ حلقہء دعوت، قیادت بھی اور افراد بھی، باہم مربوط ہو جائیں تو حقیقی روح اخوت فروغ پاتی ہے۔ وہ سب مل کر کام اور افراد دعوت کے معیار کو بلند کرتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی شخص کا دل بن جاتے ہیں۔ یک جان یک قالب ہو جاتے ہیں۔ ہر فرد آئینے کی مانند ہو جاتا ہے جس میں دوسروں کو اپنی ذات نظر آتی ہے' اور ہر شخص خواہ فرد ہو یا قیادت' دوسروں کے ہاں اپنے لیے بڑی محبت کا احساس پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں باہمی اخوت و یک جہتی فروغ پاتی ہے' باہمی اعتماد بڑھتا ہے' ہر سطح پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر دعوت کا کام تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ یوں نصیحت و خیر خواہی فریضہ اقامت دین کی احسن طور پر ادائیگی کے لیے مہمیز کا کردار ادا کرتی ہے اور ہر فرد دل و جان سے اس فرض کی ادائیگی میں جُت جاتا ہے۔ (المجتمع' ۲۵ مئی ۲۰۰۲ء)

رنج، غم اور ذہنی دباؤ سے نجات

42

نفسا نفسی اور مادہ پرستی کے اس دور میں جدید تہذیب کا ایک تحفہ ذہنی دباؤ بھی ہے۔ ہر انسان کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جو اس کیفیت سے نہ گزرے ہوں۔ مسائل کے انبار میں بے بسی کی کیفیت غالب ہوتی ہے۔ قرآن کی روشنی میں اہلِ ایمان کی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی خوف یا رنج کا موقع نہیں۔

زندگی خدائے بزرگ و برتر کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے اور ذہنی دباؤ جیسے خودساختہ مسائل کے سدِ باب کے لیے مندرجہ ذیل رہنما اُصول اپنانے چاہییں تاکہ زندگی آسان اور سہل ہو جائے۔

۱- ہمیشہ اپنی سوچ کو مثبت رکھیں۔ یاد رکھیں کہ اِس جہانِ فانی میں کوئی چیز خدائے بزرگ و برتر کے حکم اور مشیت کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ لوگ بہت پسندیدہ ہیں جو اللہ کی رضا پر راضی رہے اور شکرگزاروں میں شامل ہوئے۔ بے شک اللہ کسی ذی روح پر اُس کی طاقت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتا اور شکرگزاروں اور صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۲- نماز کو اپنا معمول بنائیں۔ بے شک نماز دلوں کو سکون دیتی ہے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ دُعا مومن کا ہتھیار ہے۔

۳- مسائل کو مصیبت نہیں بلکہ چیلنج سمجھ کر سامنا کریں۔ آپ اپنی استطاعت ہی تک ذمہ دار ہیں۔ ایک دم سارے کام کرنے کے بجائے ترجیح، اور ترتیب کے ساتھ جو ممکن ہو اس کو کریں۔

۴- زندگی کے معاملات سلجھاتے ہوئے ایک مقصدی اور متوازن اندازِ فکر اپنائیں۔

۵- کتاب انسان کی بہترین دوست اور تنہائی کی بہترین رفیق ہے۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ کریں، نئے افکار اور خیالات سے آپ کی شخصیت کو جلا، فکر کو روشنی اور شعور کو پختگی ملے گی۔

۶- اپنے قریبی لوگوں کو مسائل میں شریک کریں۔ ممکن ہے اس طرح مسائل کے حل کے لیے کوئی نئی سمت اور جہت مل جائے۔ مشورے اور شراکت سے بوجھ بانٹا جاسکتا ہے۔

۷- صبح جلدی اُٹھیں اور صبح کی سیر کو اپنا معمول بنالیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ پہلے سے زیادہ توانا اور چوکس ہیں۔

۸- جس طرح ہفتہ وار تعطیل ہمیں آرام اور توانائی بہم پہنچاتی ہے، اسی طرح کچھ وقت کسی تفریحی مقام پر گزارنے سے انسان اپنی شخصیت پر اس کے خوشگوار اثرات کو محسوس کرسکتا ہے اور ایک تازہ ولولہ حاصل کرسکتا ہے۔

سنابل العلم

تصوف: اسلامی نقطۂ نظر

سید احمد عروج قادریؒ

تصوف کا اقرار وانکار اور اس کے بارے میں بحث وتمحیص اور اعتراض و جوابِ اعتراض کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اگر کسی نے اس کا انکار کیا تو اقرار کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ انکار کس تصوف کا کیا جارہا ہے' اور اگر کسی نے اقرار کیا تو انکار کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ کس تصوف کا اقرار کیا جارہا ہے۔ اقرار کرنے والے منکرین تصوف کے درمیان مطعون ہوتے ہیں اور انکار کرنے والے حامیانِ تصوف کے درمیان مذموم قرار پاتے ہیں۔ افراط وتفریط کے درمیان توسط واعتدال کی راہ گم ہو جاتی ہے اور اس پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو ''تصوف'' کے لفظ اور اس اصطلاح پر جھگڑا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصطلاح پر جھگڑنا معقول بات نہیں ہے۔ اسی طرح بعض لوگ حقیقت سے زیادہ اس اصطلاح کو ماننے اور منوانے پر اصرار شروع کر دیتے ہیں اور یہ بات بھی قرین عقل نہیں ہے۔

راقم الحروف نے تصوف کی کتابوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے تصوف پائے جاتے ہیں: ۱-مومنانہ تصوف' ۲-فلسفیانہ تصوف' ۳-ملحدانہ تصوف۔

ملحدانہ تصوف نے اگرچہ مسلم عوام کو بہت نقصان پہنچایا ہے لیکن علمائے حق اور صوفیہ صافیہ ہمیشہ اس کی تردید کرتے آئے ہیں اور کسی مومن مخلص کو اس کے قابل ترک ہونے میں شبہہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ملحدانہ تصوف اس تصوف کا نام ہے جو بزعمِ خویش اللہ تک پہنچے ہوئے لوگوں کے لیے اسلامی شریعت کو معطل قرار دیتا ہے۔ ملحد اور گمراہ صوفیہ جو مسلمان کے بھ

منافق ہوتے ہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مقامِ یقین پر فائز ہوکر خدا رسیدہ ہوگیا تو اب وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کے شرعی احکام کا مکلف نہیں رہتا۔ اس گروہ کے نزدیک طریقت، شریعت سے بالکل علیحدہ چیز ہے، اس کے نزدیک شریعت مدرسۂ سلوک کے صرف مبتدی طلبہ کے لیے ہے۔

مومنانہ، یعنی اسلامی تصوف جن حقائق کا نام ہے آج تک کسی مومن مخلص نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ کتاب وسنت سے بصراحت ثابت اور ایمان و اسلام کے لازمی تقاضے ہیں۔ علماے حق کے درمیان اختلاف و نزاع صرف اس تصوف میں ہے جسے ہم نے فلسفیانہ تصوف کہا ہے۔ اس تصوف کی بنیاد فلسفۂ یونان اور علم الکلام کی دوراز کار بحثوں پر قائم کی گئی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل کر لی گئی ہیں جن کی تائید کتاب وسنت سے نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ قرآنی حقیقتوں کی فلسفیانہ تشریح کر کے انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا گیا ہے اور ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کے لیے انتہائی ضعیف اور موضوع حدیثوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں کوئی چیز اس وقت تک قبولِ عام حاصل نہیں کرتی جب تک اس کے لیے کوئی حدیث نہ پیش کی جائے۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے تصوف کے انکار میں شدت اسی فلسفیانہ تصوف پر زور دینے کا نتیجہ ہے۔ صوفیہ میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے لیکن ان کی روش یہ ہے کہ جو لوگ فلسفیانہ تصوف کا انکار کرتے ہیں انھیں بھی وہ اس گروہ میں داخل قرار دیتے ہیں جو مطلقاً تصوف کا منکر ہے۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے بارے میں انھوں نے ایسی غالیانہ عقیدت اختیار کر رکھی ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے اور اسی کو انھوں نے تصوف کے اقرار وانکار کی کسوٹی بنا دیا ہے۔ جو شخص ان کی اس خودساختہ کسوٹی پر کھرا اُترے، یعنی غالیانہ عقیدت میں ان کا ساتھ دے، وہ تصوف کا ماننے والا ہے اور جو اس پر کھوٹا ثابت ہو، یعنی اس عقیدت میں ان کا ساتھ نہ دے وہ تصوف کا انکار کرنے والا ہے۔ ۹۰ فی صد یہ بات بھی صادق ہے کہ انھوں نے بزرگوں کی غالیانہ عقیدت کو اپنے لیے حصولِ عقیدت کا حربہ اور وسیلہ بنا لیا ہے۔ یہ اپنے ماسبق بزرگوں کے سامنے اس لیے سر جھکاتے ہیں کہ دوسرے

لوگ ان کے سامنے سر جھکائیں' جو لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں انھیں وہ تصوف کا مخالف اور اولیا کا منکر کہہ کر لوگوں میں بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں کی عقیدت ان کے ساتھ وابستہ رہے اور اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

تصوف کی مشہور و مستند کتابوں میں اسلامی تصوف اور فلسفیانہ تصوف ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہیں اور ان دونوں کے درمیان امتیاز صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود کتاب و سنت کا علم رکھتے ہوں اور جن کے دل و دماغ بزرگوں کی اندھی عقیدت سے ماؤف نہ ہوں--- ہماری اس تحریر کا موضوع چونکہ اسلامی تصوف ہے اس لیے ہم نے فلسفیانہ تصوف سے صرف نظر کیا ہے--- ہم حسب ذیل نکات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں:

۱- اسلامی تصوف کا ماخذ کیا ہے؟

۲- تصوف کیا ہے اور صوفی کون لوگ ہیں؟

۳- کشف و کرامات والہام کوئی دلیل نہیں بلکہ خود ان کی صحت دلیلِ شرعی کی محتاج ہے۔

اسلامی تصوف کا ماخذ

تمام صوفیۂ علیہ بلا استثنا اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جس تصوف کے قائل ہیں اس کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے اور یہی اس کے اصل ماخذ ہیں۔ صرف چند اقوال یہاں نقل کرتے ہیں۔

ابوعبداللہ سہل بن عبداللہ التستری (م: ۲۷۳ھ) کہتے ہیں: ہمارے طریقے کے اصول سات ہیں: کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا' سنت کی پیروی' حلال کھانا' اذیت رسانی سے رُکنا' معصیتوں سے اجتناب' توبہ اور حقوق کی ادائیگی۔ (نتائج الافکار القدسیه' ج ۱' ص ۱۱۱)

ابوالحسین احمد بن ابی الحواری (م: ۲۴۰ھ) کہتے ہیں: جس کسی نے اتباع سنت کے بغیر کوئی عمل کیا تو اس کا وہ عمل باطل ہوگا۔ (الرسالة القشیریه' ج ۱' ص ۱۲۶)

ابوحفص عمر بن مسلمۃ الحداد (م: ۲۶۵ھ) کہتے ہیں: جو شخص ہر وقت اپنے افعال واقوال و احوال کو کتاب و سنت پر نہیں تولتا اور جو اپنے وارداتِ قلبی میں شک کر کے اسے نہیں جانچتا اسے ''مردانِ حق'' کے گروہ میں شمار نہ کرو۔ مردان حق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے

فرمایا ہے: ''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھایا''۔ یہ جو بات ابوحفص نے فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص ایسا نہ ہو وہ اپنے دشمن نفس کے فریب سے بے خوف اور اپنے حال میں مگن ہوتا ہے اور جو شخص ایسے دشمن کی عداوت سے اپنے کو محفوظ و مامون سمجھے جس سے دشمنی کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے بارے میں یہ سمجھ لے کہ کسی کا فریب اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تو ایسا شخص اللہ کی چال سے اپنے آپ کو بے خوف سمجھ رہا ہے اور قرآن میں ہے کہ: ''اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو''۔(الرسالۃ وشرحہا)

سیدالطائفہ ابوالقاسم جنید بن محمدؒ (م: ۲۹۷ھ) کہتے ہیں: جس شخص نے قرآن وحدیث کے احکام نہیں سمجھے اور ان کا علم حاصل نہیں کیا' تصوف میں اس کی اقتدا نہیں کی جا سکتی' کیونکہ ہمارا یہ علم (تصوف) کتاب وسنت سے مقید ہے اور اجماع وقیاس کا مرجع بھی یہی دونوں ہیں۔

ابوعلی روذباری جنیدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارا یہ مذہب (تصوف) اصول' یعنی کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔ پہلے قول میں ''علم'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں ''مذہب'' کا۔ پہلے لفظ سے اشارہ صحتِ علم کی طرف ہے اور دوسرے لفظ کا اشارہ صحتِ سلوک کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ کسی وقت بھی اپنے علم وعمل میں کتاب وسنت سے مستغنی نہیں ہیں۔ اس قول میں اور اس سے پہلے کے قول میں اس شخص کی تردید ہے جو راہِ سلوک میں اپنے ''وارداتِ قلبی'' پر اعتماد کرتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور سچّے ہیں' وہ انھیں کتاب وسنت پر تولنے سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ (رسالہ قشیریہ مع شرح' ج ۱' ص ۱۴۳)

السید مصطفیٰ العروسی اپنے حاشیے میں لکھتے ہیں: حضرت جنیدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ سلوک کے لیے شرط یہ ہے کہ علما سے شریعت مطہرہ کے احکام کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کرے۔ اس کے بعد اس راہ میں اس کی رہبری درست ہو سکتی ہے۔ اور جو شخص اس کے بغیر اللہ تک پہنچ جانے کا مدعی ہو وہ بدعتی ہے' نہ اس کی طرف رجوع کیا جائے گا اور نہ اس کی کسی بات پر اعتماد صحیح ہوگا۔

''علم تصوف دائرہ کتاب وسنت کے اندر ہے''، اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ علم تصوف

کتاب وسنت سے حاصل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل ہوگا اور جو شخص علماً وعملاً اس سے خارج ہو وہ زندیق (بے دین) ہے۔(نتائج الافکار' ج۱' ص۱۴۳)

ابوحمزہؒ بغدادی (م: ۲۸۹ھ) کہتے ہیں: جو راہِ خدا کا علم رکھتا ہے اس پر اس راہ کی رہروی آسان ہو جاتی ہے اور اللہ تک پہنچانے والے راستے کا رہنما بجز متابعتِ رسولؐ کوئی اور نہیں ہے' متابعت آپؐ کے احوال' افعال اور اقوال سب میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔(الرسالۃ' ج۱' ص۱۷۷)

ابواسحاق ابراہیم بن داؤد رقی (م: ۳۲۶ھ) کہتے ہیں: محبت الٰہی کی علامت' اس کی اطاعت کو ترجیح دینا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہے اس لیے کہ متابعت' محبت کا ثمرہ ہے۔ جو شخص کسی سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کی پیروی نہیں کرتا وہ اس کی محبت میں جھوٹا ہے۔ رقیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر انسان کی قیمت اس کی ہمت کے مطابق ہوتی ہے' پس اگر اس کی ہمت دنیا ہے (یعنی اس کا مطمحِ نظر دنیا کا حصول ہے) تو اس کی کوئی قیمت نہیں اور اگر اس کی ہمت اللہ کی رضا ہے تو پھر اس کی قیمت کا ادراک کرنا ممکن نہیں ہے' کوئی اُسے جان نہیں سکتا۔(نتائج الافکار' ج۱' ص۱۴۳)

ابوبکر الطمستانی (م: ۳۴۰ھ) کہتے ہیں: راستہ واضح ہے اور کتاب وسنت ہمارے درمیان موجود ہیں اور صحابہؓ کا فضل وشرف معلوم ہے اس لیے بھی کہ وہ آپؐ کی صحبت میں رہے اور اس لیے بھی کہ انھوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کی اور جہاد کیا' رہے ہم لوگ تو ہم میں سے جس نے کتاب وسنت کی صحبت اختیار کی' یعنی کتاب وسنت میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا اور جس نے اپنے نفس اور مخلوق کی اطاعت سے منہ موڑا اور اپنے دل سے اللہ کی طرف ہجرت کی وہی سچا ہے اور اس نے ابدی سعادت کا راستہ پالیا ہے۔(الرسالۃ' ج۱' ص۱۷۷)

ابوالقاسم ابراہیم بن محمد النصرآبادی (م: ۳۶۷ھ) کہتے ہیں: تصوف کی اصل یہ چیزیں ہیں: کتاب وسنت کی پابندی' خواہشات و بدعات کا ترک' مشائخ کا احترام' مخلوق کی معذرتوں کو قبول کرنا' اوراد پر مداومت' رخصتوں کے ارتکاب سے پرہیز' تاویلات کو ترک کرنا۔ اس قول میں مشائخ سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم وعمل کے لحاظ سے کامل ہوں اور جنھوں نے ان مباحات سے بھی

اعراض کیا ہو جو ذکر و عبادت میں حارج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً احترام و اکرام کے مستحق ہیں۔ اوراد وِرد کی جمع ہے، ان سے مراد وہ نفل عبادتیں ہیں جو بندہ اپنے رب کی رضا اور تقرب کے لیے روزانہ کرتا ہے۔ یہ عبادتیں اللہ کے لطف و کرم کو جاری رکھتی اور دلوں کو زندہ کرتی ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ ''رخصتوں'' سے یہاں مراد آرام و راحت، تنعم اور لذائذ ہیں۔ ''تاویلات'' سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں بندہ اپنے نفس میں یہ خیال کرے کہ نہ اسے کرنے میں گناہ ہے، اور نہ ترک میں گناہ ہے، وہ یہ نہ سوچے کہ قربِ الٰہی کے حصول میں اس کا فعل یا ترک مفید ہے یا نہیں۔ (الرسالۃ مع شرح، ج۲، ص۱۵)

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م:۵۹۱ھ) کہتے ہیں: کتاب و سنت کو اپنے سامنے رکھو، تامل و تدبر کے ساتھ ان دونوں کا مطالعہ کرو اور انھی دونوں کو اپنا دستور العمل بناؤ اور قال و قیل اور ہوا و ہوس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ (فتوح الغیب، مقالہ ۳۶)

آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں: سیدنا محمدؐ کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں اور قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں کہ ہم اس پر عمل کریں، لہٰذا تم ان دونوں کے دائرے سے باہر نہ نکلو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمھاری خواہش اور شیطان تمھیں گمراہ کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ سلامتی کتاب و سنت کے ساتھ ہے اور ہلاکت غیر کتاب و سنت کے ساتھ۔ (ایضاً)

گویا جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی طرف جھکتا ہے وہ گمراہ ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل بن عطا (م ۳۰۹ھ) معقول و منقول دلیل کے ساتھ اتباع سنت پر زور دیتے ہیں: جو شخص اپنے آپ کو آدابِ شریعت کا پابند کر دیتا ہے، اللہ اس کے قلب کو نورِ معرفت سے روشن کر دیتا ہے اور حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے اشرف کوئی مقام نہیں ہے، متابعت آپؐ کے اوامر، افعال اور اخلاق سب میں۔ کیونکہ حضورؐ ہی جانتے ہیں کہ وہ افضل عمل کون سا ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے اور وہ اس کے تقرب کا بہترین ذریعہ ہے، حضورؐ بہ نفس نفیس اپنی

تمام حرکات وسکنات میں اللہ کی مدد سے، افضل ترین طاعات پر عامل تھے۔ لہٰذا اس میں جو شخص بھی آپؐ کی پیروی کرے گا اس کا مقام سب سے بلند ہوگا اور اسی بلند مقامی کی ایک بات یہ ہے کہ وہ اللہ کا محبوب بن جائے گا۔ اللہ خود فرماتا ہے: ''اے نبیؐ، کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمھیں محبُوب رکھے گا''۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سنت کا اتباع، عبادات، عادات واخلاق اور اعتقادات، سب میں لازم ہے اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ان کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے اور جس شخص نے بھی کوئی نئی بات پیدا کی ہے جس سے سنت رسولؐ کی مخالفت ہوتی یا اس میں تغیّر پیدا ہوتا ہے خواہ یہ مخالفت اور تبدیلی قول میں ہو یا عمل میں یا اعتقاد میں، وہ گمراہی ہے اور مردود ہے۔ (مکاتیب و رسائل، مکتوب ۹)

تصوف کیا ھے اور صوفی کون لوگ ھیں؟

صوفیہ کے اقوال پیش کرنے سے پہلے یہ یاد دہانی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ ''تصوف'' اور ''صوفی'' کی اصطلاحیں بہت مشہور ہیں، لیکن صوفیۂ کرام اپنی کتابوں میں یہ بھی لکھتے آرہے ہیں کہ یہ دونوں لفظ قرآن و حدیث میں نہیں آئے ہیں۔ اس لیے نہ ''تصوف'' کا لفظ مطلوب ہے اور نہ ''صوفی'' کا لقب مقصود ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (م: ۶۲۲ھ) عوارف المعارف میں لکھتے ہیں: پورب سے پچھّم تک اسلامی ممالک کے دونوں کناروں میں اہل قرب کے لیے ''صوفی'' کا نام معروف ومشہور نہیں ہے۔ یہ نام انھی لوگوں کے لیے معروف ہے جو خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ بلاد مغرب، بلاد ترکستان اور ماوراء النہر میں بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں لیکن وہ ''صوفیہ'' سے موسوم نہیں ہیں کیونکہ وہ صوفیہ کا لباس استعمال نہیں کرتے۔ اور الفاظ و اصطلاحات میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ سے ہماری مراد ''مقربین'' ہی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چھٹی، ساتویں صدی ہجری تک ''صوفیہ'' کے نام سے وہی لوگ جانے پہچانے جاتے تھے جو خاص قسم کا لباس پہنتے تھے لیکن بعد کو لباس کی قید اُٹھ گئی اور یہ نام اس طبقے کے

لیے مشہور ہو گیا جس میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہو اور وہ بزرگوں کے بارے میں غالیانہ عقیدت رکھتا ہو---شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء میں لکھا ہے: علوم احسان ویقین کہ آج کل تصوف کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں...... تصوف کی حقیقت جس کا نام عرف شرع میں ''احسان'' ہے۔ (ازالة الخفاء ' مقصد دوم' ص ۱۴۲)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ ''تصوف'' کوئی شرعی نام نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی نام احسان ہے---بعض علماے صوفیہ نے تصوف کو طریق تقویٰ کہا ہے اور تصوف کے لیے ''تزکیہ نفس'' کی اصطلاح تو اتنی ہی مشہور ہے جتنی خود تصوف کی اصطلاح۔ بہرحال' علوم احسان ویقین کہیے یا طریق تقویٰ یا تزکیۂ نفس' یہ سب اس تصوف کی تعبیریں ہیں جس کی بنیاد کتاب وسنت پر قائم ہے اور جسے ہم اسلامی تصوف کہتے ہیں۔

تصوف کو ''احسان'' کہنے کی وجہ وہ حدیث ہے جس میں حضرت جبریلؑ نے صحابہ کرامؓ کے مجمع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے بارے میں چند سوالات کیے تھے اور آپؐ نے جوابات دیے تھے۔ احسان کے بارے میں سوال و جواب کے الفاظ یہ ہیں: مجھے احسان کے بارے میں بتایئے۔ حضورؐ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمھیں دیکھ رہا ہے۔ (ریاض الصالحین ' بحوالہ مسلم)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ حدیث تصوف کی بہت بڑی اصل ہے اور تصوف کی تمام مستند کتابوں میں اس سے استدلال کیا گیا ہے۔ تصوف اب ایک مستقل علم کا نام ہے اس لیے اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

> تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی' اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی و آراستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔ (شیخ الاسلام زکریا انصاری' شرح الرسالة القشیریه ' ج ۱' ص ۶۹' ترمذی ' ابن ماجه)

اس عبارت میں علم تصوف کی فنی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کی غرض و غایت بھی بتائی گئی ہے۔ ائمۂ صوفیہ اپنی کتابوں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

العلماء ورثة الانبياء (مشکوٰۃ، کتاب العلم' بحوالہ ابوداؤد)' علما انبیا کے وارث ہیں۔ اور حضورؐ نے فرمایا ہے: من عمل بما علم ورثة الله علم مالم يعلم ، آدمی جو کچھ جانتا ہے جب اس پر عمل کرتا ہے تو اللہ اسے ایسی باتوں کا علم عطا کرتا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ علم الوراثة دین میں فہم وبصیرت کا نام ہے اور اسی کو قرآن میں ''حکمت'' سے تعبیر کیا گیا ہے:

يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ٥ (البقرہ ۲:۲۶۹)

وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ مل گیا مگر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اب میں تصوف اور صوفی کے بارے میں ائمۂ تصوف کے چند اقوال نقل کرتا ہوں:

میں نے محمد بن احمد بن یحییٰ صوفی کو کہتے ہوئے سنا' وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن تمیمی کو کہتے ہوئے سنا کہ ابومحمد جریری سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ تصوف ہر بلند اخلاق میں داخل ہونے اور ہر پست اخلاق سے خارج ہونے کا نام ہے۔ بلند اخلاق جیسے ورع' زہد' توکل' رضا اور تفویض وغیرہ' اور پست اخلاق جیسے ریا' عجب' کبر' حسد اور بدگمانی وغیرہ۔ (الرسالة القشيريه مع شرح' ج ۴' ص ۴)

امام قشیری نے اپنی کتاب کے ''باب التصوف'' میں خود اپنی سند سے سب سے پہلے یہی قول نقل کیا ہے۔ اس قول کا حاصل یہ ہے کہ ہر بلند اخلاق سے آراستگی اور ہر پست اخلاق سے پاکی وصفائی ہی حقیقی تصوف ہے۔

عمرو بن عثمان مکیؒ سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اس کام میں مشغول ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت کے لیے بہترین اور مناسب ترین ہو''۔

شارحین نے اس جملے کی تشریح میں لکھا ہے کہ صوفی کی شان یہ ہے کہ وہ مختلف اوقات میں اعمال' اخلاق' احوال اور ہر عمل خیر میں سے اسی کو اختیار کرتا ہے جو اس وقت کے لحاظ سے افضل ترین واکمل ترین شے ہو اور جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہو۔ اس کا

مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ ہر وقت' اس کے عمل کی بنیاد کتاب وسنت کے احکام پر ہوتی ہے۔ کیونکہ انھی کے ذریعے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ مختلف اوقات میں کون سی چیز سب سے زیادہ مناسب ہے۔ افسوس کہ اس زمانے کے اکثر صوفیہ نے تصوف کی اس حقیقت کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا ہے کہ: تصوف یہ ہے کہ آدمی حقائق کو اختیار کرے اور مخلوق کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوس ہوجائے۔

اس کی تشریح میں شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں: جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو اور وہ یہ جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی نافع' ضار اور معطی نہیں ہے' نفع وضرر اور عطا و بخشش صرف اُس کے دستِ قدرت میں ہے' ایسا شخص یقیناً انھی اعمال کو اختیار کرے گا جو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں۔ اس کی نظر ان چیزوں پر نہ ہوگی جو مخلوق کے قبضہ وتصرف میں ہیں' اس کا اعتماد صرف اللہ پر ہوگا اور کسی پر نہیں۔

حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کے وزیر کو اللہ نے توفیق بخشی اور وہ بادشاہ کے دربار سے کنارہ کش ہوگیا۔ بادشاہ نے اُسے پکڑ بلوایا اور دھمکی کے انداز میں کہا' کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ وزیر نے کہا' ہاں' اس لیے کہ میں نے تم سے بہتر بادشاہ کو پالیا ہے۔ بادشاہ کا غصہ اور بڑھا۔ اس نے پوچھا' مجھ سے بہتر بادشاہ کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا' وہ بادشاہ تم سے بہتر ہے جو مجھے کھلاتا ہے مگر اسے خود کھانے کی ضرورت نہیں' اور تمھارا حال یہ ہے کہ جب تک تمھیں کھلایا نہ جائے تم مجھے کھلا نہیں سکتے۔ تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے جو مجھے سُلاتا ہے لیکن خود اُسے نیند نہیں آتی' اور تمھارا حال یہ ہے کہ جب تک تم سو نہ جاؤ میں سو نہیں سکتا۔ تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ میری خطائیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ مجھے معاف فرما دیتا ہے' لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ معمولی قصور پر بھی مواخذہ کرتے ہو۔ تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں لگا تو سارا عالمِ وجود میری خدمت کرنے لگا' اور تمھاری خدمت کا حال یہ تھا کہ میں مجبور تھا کہ تمھارے ہر مقرب کی خدمت کروں تاکہ وہ مجھے اذیت نہ پہنچائے۔ یہ سن کر بادشاہ نے جواب دیا' تم نے سچ کہا' بے شک وہ مجھ سے بہتر ہے۔ اس کی چوکھٹ سے چمٹ جاؤ اور اس کی اطاعت کو غنیمت سمجھو۔ (شرح رسالہ' باب التصوف)

شیخ الاسلام کی یہ تشریح اور یہ حکایت کتنی مؤثر اور دل نشین ہے۔

ایک بار حضرت جنیدؒ بغدادی نے فرمایا: تصوف اجتماع کے ساتھ ذکر' استماع کے ساتھ وجد اور اتباع کے ساتھ عمل کا نام ہے۔ شارحین اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''اجتماع'' سے مراد اجتماع ہمت ہے' ذکر مع اجتماع کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر پورے حضور قلب اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے کیونکہ غفلت مذموم ہے اور عمل' حسن نیت ہی سے صحیح ہوتا ہے۔ ''وجد'' تصوف کی اصطلاح میں جذبۂ اشتیاق و محبت کی زیادتی کو کہتے ہیں اور استماع سے مراد کسی ایسی چیز کا سننا ہے جو اس جذبے میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ وجد مع استماع کا مطلب یہ ہوا کہ مؤثر مواعظ یا ایسی باتیں سُن کر جن کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو' جذبۂ شوق میں زیادتی اور تحریک پیدا کی جائے۔ ''عمل مع اتباع'' میں اتباع سے مراد اتباع سنت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر عمل سنت کے مطابق ہو' کیونکہ ہر وہ عمل' یا حال یا مقام جو اتباعِ سنت سے خالی ہو' بدعت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے صحبت یافتہ ابوبکر کتانی نے کہا ہے: تصوف اخلاق جمیلہ سے آراستگی کا نام ہے۔ جو شخص تم سے اخلاق حسنہ میں بڑھا ہوا ہے وہ تم سے صفائے قلب اور تصوف میں بڑھا ہوا ہے۔ (شرح رسالہ' باب التصوف)

ذوالنون مصریؒ سے اہل تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب میں کہا: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ عزوجل کو ہر دوسری شے پر ترجیح دی تو اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر دوسری شے پر ترجیح عطا فرمائی۔

محشیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کو ہر دوسری شے پر ترجیح دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضیات اور پسندیدہ چیزوں کو اس کی نامرضیات اور ناپسندیدہ چیزوں پر ترجیح دی جائے' اور انھیں دوسری چیزوں پر ترجیح دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کے عمل کے مطابق ان کا درجہ مقرر فرماتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تصوف کی حقیقت جسے فلسفیانہ تصوف نے انتہائی پیچیدہ اور ناقابل قبول بنا دیا ہے۔

کشف و کرامت

اب تک جو تفصیل پیش کی جا چکی' اس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سلوک باطن کی راہ بھی دین ہی کی روشنی میں طے کی جا سکتی ہے۔ اس روشنی کے بغیر یہ راہ خطرات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر اللہ و رسولؐ کے احکام' دینی حقیقتیں اور اس کے مسلّمات نظر سے اوجھل ہوں یا اوجھل کر دیے جائیں تو اسلامی تصوف' ملحدانہ تصوف کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب جاہل اور مکار صوفیوں نے کشف و کرامت' ارادتِ قلبی اور الہامات' غیر شرعی حقائق اور خدا رسیدگی کے دعوے کر کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا تو علماے حق اور صوفیۂ صدق کو پوری قوت سے یہ بتانا پڑا کہ اصل شے شریعت' احکامِ الٰہی کی تعمیل اور اس پر استقامت ہے۔ یہ نہ ہو تو تمام دعوے غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اصل کسوٹی کتاب و سنت ہے۔ اس پر جانچے اور پرکھے بغیر کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے۔ اس طرح کی صراحتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ اور ہم یہاں خاص طور سے اس سلسلے کی چند صراحتیں نقل کر رہے ہیں۔

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی (م: ۲۶۱ھ) کہتے ہیں: اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامتیں دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا ہے' اس سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی' حدود کے تحفظ اور ادائے شریعت کے معاملے میں تم اس کو کیسا پاتے ہو۔ (الرسالة القشیریه)

اس قول کی شرح کرتے ہوئے' شیخ الاسلام لکھتے ہیں: بسطامیؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ کرامت تو وہ شے ہے جو صاحبِ کرامت کے ان کاموں میں مددگار ہوتی ہے جو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں۔ وہ اس کے یقین کو قوی کرتی اور اللہ کی محبت و رضا پر اسے ثابت قدم رکھتی ہے' لہٰذا جب کوئی خارقِ عادت شے کسی بندے سے ظاہر ہو لیکن شریعت اس کی استقامت پر گواہ نہ ہو تو ایسا شخص مکر و فریب اور دھوکے میں مبتلا ہے۔ (احکام الدلالة' شرح الرسالة' ج ۱' ص ۱۰۹)

ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن عطیۃ الدارانی (م: ۲۱۵ھ) کا ارشاد ہے: میں نے جنید بغدادیؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں: بسا اوقات صوفیہ کے لطائف و نکات میں سے کوئی نکتہ کئی دنوں تک میرے دل میں آتا رہتا ہے لیکن میں اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرتا جب تک

دو شاہد وعادل' کتاب وسنت' اس کی صحت پر گواہی نہ دیں۔ (رسالہ قشیریہ مع شرح' ج ۱' ص ۱۱۴)

ابوالحسن احمد بن محمد النوری (م: ۲۹۵ھ) کہتے ہیں: جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنی کسی ایسی حالت کا دعویٰ کر رہا ہے جو اسے علمِ شرعی کی حد سے باہر نکالنے والی ہے تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بدعتی ہے۔ شریعت جس کے افعال واقوال کی صحت پر گواہ نہ ہو وہ مبتدع ہے اگرچہ اس سے خارق عادت باتیں صادر ہو رہی ہوں۔ کیونکہ یہ اس کے ساتھ ایک طرح کا مکر ہے۔ (ایضاً' ص ۱۵۰)

ابومحمد رویم بن احمد (م: ۳۰۲ھ) کہتے ہیں: ''صوفیہ کا علم روح کو صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہوتا''۔ روح کو صرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ طاعات کی تعمیل اور شہوات سے اعراض میں اپنی پوری کوشش لگا دی جائے۔ رویم نے کہا: اگر تم اس وصف کے ساتھ اس راہ میں آنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنے آپ کو صوفیہ کی یاوہ گوئی میں مشغول نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل کے بغیر محض صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کرنے اور ان کے باطل طریقوں اور اعمال سے خالی بکواس میں مشغول ہونے سے حقیقی تصوف حاصل نہیں ہوتا۔ (ایضاً' ص ۱۵۳)

حضرت رویم کا یہ قول دیکھیے اور آج کل کے ''صوفیہ'' کو دیکھیے۔ ۹۰ فی صد ایسے ہی لوگ ہیں جو صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کر کے اور ان کی لایعنی باتوں میں مشغول ہو کر ''صوفی'' اور ''صحیح العقیدہ'' مسلمان بنے ہوئے ہیں' اور ان کے مقابلے میں جو لوگ فرائض و واجبات کے پابند اور معاصی سے پرہیز کرنے والے ہیں انھیں تصوف کا منکر اور بدعقیدہ قرار دیا جا رہا ہے۔

ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز (م: ۲۷۷ھ) کہتے ہیں: ''ہر باطن' جس کا ظاہر مخالف ہے باطل ہے''۔ باطن سے مراد وہ بات ہے جو دل میں آتی ہے اور ظاہر سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دل کی جس بات کو شریعت صحیح قرار نہ دے وہ باطل ہے۔ (ایضاً' ص ۶۸)

اس کے قریب سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ قول بہت مشہور ہے: اور ہر حقیقت' جسے شریعت رد کر دے وہ بے دینی ہے۔ (فتوح الغیب مع شرح' ص ۷۶)

اس جامع اور بلیغ جملے کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے: اس جملے کا

مطلب یہ ہے کہ اگر حکم شریعت کے خلاف کسی پر کوئی کشف ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ اسے اس کا حکم دیا گیا ہے تو یہ دعویٰ باطل ہے' اور اگر وہ اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد کرے تو کافر اور بے دین ہو جائے گا۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلك۔ (شرح فتوح الغیب' ص ۷۶)

شیخ جیلانیؒ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: اگر دل میں کوئی خیال آئے یا کسی بات کا الہام ہو تو انھیں کتاب وسنت پر پیش کرو۔ (فتوح الغیب' ص ۷۲)

یہ قاعدۂ کلیہ بیان کر کے شیخ جیلانی قدس سرہ نے اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں' سب کا حاصل یہ ہے کہ غیر نبی کا الہام دلیلِ شرعی نہیں ہے' دلیلِ شرعی کتاب وسنت ہی ہیں۔ یہی دونوں فیصلہ کریں گے کہ وہ الہام قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہے یا نہیں۔

ان عبارتوں سے واضح ہوا کہ کرامت ہو یا کشف یا الہام یا کوئی بھی خواب و خیال' جب تک کتاب وسنت ان کے صحیح ہونے پر گواہی نہ دیں وہ لائق اعتبار بھی نہیں ہیں' ان کا قابلِ عمل ہونا تو دُور کی بات ہے۔

تربیت: چند بنیادی باتیں

خرم مرادؒ

تربیت کے معنی ترقی اور نشو ونما کے ہیں۔ ترقی اور نشو ونما کسی سمت میں اور کسی منزل کی طرف ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بہت سے سانچوں میں ڈھال سکتا ہے اور جو شخصیت اور صلاحیتیں اللہ نے عطا کی ہوں ان کو بہت سارے پہلوؤں سے پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔

تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اُس مقصد کے حصول کے لائق بنائیں' اُس کا اہل بنائیں جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس لحاظ سے تربیت کا عمل' اس کا نہج' اس کا طریقۂ کار اور اس کے اجزا مقصد کے لحاظ سے متعین ہوں گے۔

فوج میں تربیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جسمانی طور پر اور لڑنے کی صلاحیت کے لحاظ سے اتنی تربیت ہو کہ جنگ جیتی جاسکے اور دشمن کا مقابلہ کیا جاسکے۔ ایک مدرسے میں تربیت کے معنی یہ ہوں گے کہ علمی صلاحیتیں' علم کی تطبیق' بیان واظہار اور تجزیے کی صلاحیتیں پروان چڑھائی جائیں۔ اس لحاظ سے جب ہم تربیت کے لیے جمع ہوں تو زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے یہ چیز روزِ روشن کی طرح واضح ہو کہ وہ کیا مقصد ہے جس تک پہنچنے کے لیے ہم اپنی شخصیت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ جتنا وہ مقصد صاف اور واضح ہوگا' اتنی ہی صحیح سمت میں' صحیح راستے پر' صحیح طریقے سے آگے بڑھنا اور اپنی منزل تک پہنچنا آسان ہوگا۔

ہمیں ایک جماعت کی صورت میں جمع کرنے اور منظّم کرنے والی چیز اس دنیا میں غلبۂ اسلام کی جدوجہد ہے۔ اس کے لیے اچھا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا مسلمان

ہونے کے لیے ایمان اور اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ مسلمان اپنا مال اور جان اللہ کی راہ میں لگائے۔ چونکہ اب عرصے سے ایک اچھے مسلمان کی تعریف سے یہ حصہ خارج ہو چکا ہے' اس لیے ہم کو اس کو بھی علیحدہ سے اپنے ذہن میں تازہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسا مسلمان' مسلم' مطیع' متقی اور محسن بندہ دیکھنا چاہتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہو' جس سے وہ محبّت کرتا ہو۔ ہماری کوشش ہو کہ ہم ویسا بنیں اور اگر ویسا نہ بن سکیں تو اس کے جتنے قریب پہنچ سکیں اتنا قریب پہنچیں' اور ایسا بننے کی کوشش میں لگے رہیں' کم از کم اس کوشش سے بے نیاز نہ ہوں۔ لیکن اسی کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد میں ہم اپنی قوتیں' صلاحیتیں' محنتیں' مال و دولت' یہ سب لگانے کے قابل ہوں۔

تربیت کا مقصد

اگر ہم تربیت کے مقصد کو بہت مختصر انداز میں بیان کرنا چاہیں' ذہن نشین کرنا چاہیں تو بنیادی طور پر تو وہ مقصد اللہ کی جنت کا حصول ہے جس کی طرف اس نے اپنی کتاب ہدایت میں بار بار بلایا اور پکارا ہے اور دعوت دی ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۳) ''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے''۔ لہٰذا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تربیت کا وہی عمل مفید ہوگا جس میں تربیت کرنے والے کی نگاہوں میں یہ منزل ہمیشہ واضح رہے اور اسی پر نگاہیں جمی رہیں۔ اسی کے لیے بے چینی اور خلش رہے کہ میں وہ کام کروں کہ میرا قول و فعل اور عمل مجھے جنت کے قریب کر دے' اور ان کاموں سے دُور رہوں جو جنت سے دُور کریں اور نارِ جہنّم سے قریب کر دیں۔ اگر میں بات یہیں ختم کر دوں تو یہ بھی کافی ہے۔ اس لیے کہ تربیت کے لیے بہت طویل تقریروں کی اور لمبے مباحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آدمی ایک ہی بات پالے تو یہ اس کی تربیت کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔

حدیث میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے عرض کی کہ اُس کو قرآن کی کچھ تعلیم دیں جس کو وہ باقاعدگی سے پڑھا کرے اور اس سے

ہدایت حاصل کرتا رہے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اس کی تعلیم و تربیت پر مامور فرمایا۔ انھوں نے اس کو سورۂ زلزال کی تعلیم دی۔ جب آخری آیت پر پہنچے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزلزال ۹۹: ۷-۸) ’’پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا‘‘--- اس نے کہا یہ میرے لیے کافی ہے۔ غور کیجیے کہ اگر اتنی ہی بات کسی آدمی کے ذہن میں رہے کہ اگر وہ ذرہ برابر بھی برائی کرے گا تو وہ سامنے آئے گی اور ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا تو وہ بھی سامنے آئے گی‘ تو یہ بھی اس کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے اور صحیح راستے پر چلانے کے لیے کافی ہے۔

ایک روایت کے مطابق جب حضرت علیؓ نے حضورؐ کے سامنے اس بات کو بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو‘ وہ آدمی تو فقیہہ بن گیا۔ اس نے سمجھ لیا ہے کہ دین کا ماحصل کیا ہے۔ دین کا ماحصل تو یہی ہے کہ آدمی ہمیشہ اس اندیشے اور اس خیال سے اپنے اعمال پر نگاہ رکھے کہ اسے ان کا جواب اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔

اگر ہم صرف اتنی بات کو بھی پالیں کہ اس ساری تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی جنت کی منزل سے قریب ہوسکیں‘ اور یہی ایک ترازو اگر ہاتھ میں رہے اور دل میں لٹکی ہوئی ہو اور جو بات بھی منہ سے نکلے اور جو کام بھی کیا جائے‘ اور جہاں بھی آدمی کا وقت لگے اور مال خرچ ہو‘ وہاں توجہ صرف اسی طرف ہو اور اسی ترازو پر ہم تول کر دیکھ لیں کہ آیا یہ مجھے اپنی منزل سے قریب کرنے والی چیز ہے یا دُور کرنے والی‘ تو صرف یہی ایک بات بھی ایک فرد کی تربیت کے لیے کافی ہوسکتی ہے‘ اگر اس کو اختیار کرلیا جائے۔

تربیت کے لیے جس عمل اور محنت کی ضرورت ہے وہ منزل کی مناسبت سے آدمی کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے وہ منزل ہو کہ جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں تو اسی کی مناسبت سے وہ اپنی تربیت کریں گے‘ اور جتنی وسیع جنت ہے اتنی ہی وسعت اور اتنی ہی بلندی پر اڑان اور پرواز کے لیے‘ ان کے پاس میدان ہوگا اور فضا ہوگی۔ اس کے نتیجے میں انسان کے دل‘ نظر‘ سوچ اور اخلاق و اعمال سب میں یہ وسعت پیدا ہوگی۔ اصحاب الجنۃ‘

جو جنت میں جانے والے ہیں' ان کا جو سانچہ قرآن مجید نے پیش کیا ہے اس کے مطابق وہ اپنے آپ کو بنائے گا۔ درحقیقت اصل چیز تو منزل کا شعور اور اس کا واضح ہونا اور اس کا مطلوب ومقصود بننا ہے' اور اس کی خاطر کوشش کرنا اور محنت کرنا ہے اور اسی پر نگاہیں جمائے رکھنا ہے۔

نصب العین کے معنی نگاہ کو کسی چیز پر جما دینے کے' نظر کو ٹھیرا دینے کے ہیں۔ چنانچہ جہاں نگاہ اٹک جائے وہاں دل بھی اٹک جاتا ہے' اور جس کے نگاہ اور دل دونوں اسیر ہو جائیں تو پھر پورا عمل اور زندگی اسی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ ایک مسلمان کی نگاہ و دل جہاں ٹھیرنی چاہیے' جو اس کا مطمح نظر ہونا چاہیے' اور جس کی اسے تلاش اور طلب ہونی چاہیے وہ جنت ہے! لہٰذا نگاہ جس کی تلاش میں رہے وہ جنت ہے اور دل میں جس کی طلب اور آرزو ہو وہ جنت ہے اور جس کے اوپر اپنی کوششوں کو' اعمال کو' محنتوں کو اور اپنے آپ کو جانچنا چاہیے وہ جنت ہے۔

تربیت کی راہ میں یہ پہلی چیز ہے جو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہنی چاہیے۔ جنت کے حصول کے لیے بہت سارے اعمال ہیں۔ ان میں جو سب سے بڑا عمل ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ اسی لیے ایمان کی نشانیوں میں' ایمان کی علامتوں میں' اور ایمان میں سچے اور کھرے ہونے کی کسوٹی میں یہ بھی ہے کہ درحقیقت مومن وہی ہیں جو ایمان لائیں اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو اونٹ کے کوہان سے تشبیہ دی ہے۔ گویا دین میں جو سب سے اعلیٰ اور اونچا مقام ہے وہ جہاد کو حاصل ہے۔ ہماری یہ تحریک قائم ہی اسی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اسی چیز نے ہم سب کو جمع کیا ہے کہ دین کے مطالبات میں اقامت دین کا مطالبہ' اور دین کے فرائض میں سے جہاد کا فرض' اور دین میں مطلوب اشیا میں سے دین کے غلبے کا کام' یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے ہاں سرفہرست ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے قرب اور اس کی طرف توجہ' اس کی طرف رغبت اور اس کی قربت اور اس کے ساتھ مناجات اور اس کی خاطر بھوکا پیاسا رہنا اور اس کی خاطر اپنی محبوب دنیا کو قربان کرنا' یہ چیزیں کوئی کم درجے کی ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قرآن مجید کی مختلف سورتیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کا حکم ساتھ ساتھ دیا ہے۔ اگر ایک طرف یہ فرمایا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ (مدثر ۷۴:۲) ''اٹھ اور (لوگوں کو) ڈرا'' تو دوسری طرف فوراً بعد یہ حکم بھی دیا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ○ (مزمل ۷۳:۱-۲) ''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم''۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ○ (''اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو''۔(مزمل ۷۳:۸)۔ اگر یہ فرمایا کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○ (والضحیٰ ۹۳:۱۱)' کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت کی نعمت دی ہے اس کو دوسروں تک پہنچاؤ' بیان کرو تو اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ○ (الم نشرح ۹۴:۷)' کہ جب بھی فارغ ہو تو پھر اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ جوڑو' اسی کی طرف رغبت اختیار کرو۔ اگر یہ حکم دیا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ (العلق ۹۶:۱)' یعنی اللہ کے نام سے پڑھو اور سناؤ جو ہدایت کہ تمھارے پاس آئی ہے تو آخر میں یہ بھی فرمایا کہ سجدہ کرو اور اس سے قریب ہو جاؤ۔ جہاں یہ فرمایا: وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ (الحج ۲۲:۷۸)' کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے' اور اسی کے لیے اس نے تم کو منتخب کیا ہے' وہاں یہ بھی فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ○ (۲۲:۷۸)' اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔ وہی تمھارا مولیٰ ہے بہترین دوست اور بہترین مددگار۔ گویا جہاں بھی اقامت دین کا' خدا کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے وہاں خدا سے تعلّق مضبوط کرنے کا حکم بھی دیا ہے' اس سے بھی ان دونوں پہلوؤں کی اہمیّت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جہاد کا کام اللہ کے ساتھ گہرے تعلّق اور للّٰہیت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو چیز مقصود ہے' وہ یہی ہے کہ انسان اپنے ارادے سے اللہ کی بندگی اختیار کرے اور اس کی راہ میں اپنی جان و مال' سب کچھ لگا دے۔ جو کچھ اللہ نے دیا ہے وہ بھی لگا دے اور اگر وقت آئے تو اپنا سر بھی اس کے قدموں میں نثار کر دے۔

منزل کا تعین

تربیت کے مقصد کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ دنیا میں جو کام ہمیں کرنا ہے' اس کام کے جو تقاضے اور مطالبات ہیں' ان کی مناسبت سے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ ہمیں اس بات کا پورا ادراک' شعور اور فہم ہو کہ ہم دنیا میں کیا کرنے آئے ہیں۔

ہم نے پہلے دن سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ ہمارے سامنے جو مقصد ہے وہ ایک نئی دنیا کی تعمیر ہے۔ اس کو ہم ''عالمگیر اسلامی انقلاب'' کے نام سے بھی پکارتے ہیں اور ''امامت عالم کے منصب کو حاصل کرنے'' کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے ''انسانی زندگی کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لینے'' کی تعبیر بھی اختیار کی ہے لیکن سب کا مقصد ہے دنیا کی امامت' انسانوں کی رہنمائی اور ایک نئی تہذیب و تمدن کی تعمیر۔ یہ دراصل ہمارا مقصد ہے اور ہر شخص کے سامنے یہ مقصد واضح ہونا چاہیے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان باصلاحیت ہو' بہت اچھا بولنے والا ہو' اچھا لکھنے والا ہو' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو تب ہی وہ دنیا کی قیادت سنبھال سکتا ہے۔ اس امت کے اولین دور میں جن لوگوں نے دنیا کی امامت سنبھالی اور ساری دنیا کو فتح کرلیا وہ مکہ کے چھوٹے چھوٹے تاجر تھے۔ مدینہ کے معمولی کسان اور عرب کے صحراؤں میں بکریاں چَرانے والے بدو تھے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں تو بڑا حقیر ہوں اور میرا کام اتنا ہی ہے کہ اپنے گاؤں میں ایک اجتماع کرلیا کروں' بس اتنا ہی کام کافی ہے۔ ممکن ہے کرنے کا کام بہت تھوڑا ہو لیکن ذہن میں اس بات کا واضح اور صاف ہونا بہت ضروری ہے کہ اصل مقصد وہ نہیں ہے جو آدمی گاؤں میں کر رہا ہے' اصل مقصد اجتماع کرنا یا کتاب پڑھا دینا بھی نہیں ہے' اور اصل مقصد جلوس نکالنا بھی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد تو ساری دنیا کو تبدیل کر دینا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کوششیں جو جگہ جگہ ہو رہی ہیں' وہ سب مل کر اس عظیم الشان مقصد کی کامیابی کا ذریعہ ضرور بنیں گی۔ لیکن جب تک ہر کوشش کا رخ وہی نہ ہو اور ہر کوشش سے مطلوب وہی عظیم الشان تغیر و تبدل نہ ہو' اس وقت تک انسان وہ نہیں بنے گا جو وہ بننا چاہیے۔

عرب کے بدو' کسان اور تاجر اس لیے عظیم الشان انسان بن گئے تھے کہ ان کو یہ بات معلوم تھی اور ان کے سامنے یہ منزل واضح اور روشن تھی کہ بالآخر قیصر و کسریٰ کے محلات اور ان کی سلطنتیں ان کے ماتحت آنے والی ہیں۔

مکہ میں بھی یہ بات عام تھی کہ اگر تم لوگوں نے لا الٰہ الا اللہ کو اختیار کر لیا تو عرب اور عجم تمھارے زیرنگیں آ جائیں گے۔ ہجرت کی طرف سفر کرتے ہوئے جب دو آدمی اس حالت میں نکلے تھے کہ پیچھے دشمن قتل کے درپے تھا اور آگے مدینہ میں کیا صورت حال پیش آنے والی تھی' آیا پناہ ملے گی بھی یا نہیں' اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی حضورؐ نے سراقہ بن جعشم کو جب امان کا پروانہ لکھ کر دیا تھا تو یہی پیشنگوئی فرمائی کہ ایک دن آئے گا کہ کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھ میں ہوں گے۔

غور کیجیے کہ کن حالات میں یہ بات کہی جا رہی ہے۔ اوپر سورج ہے اور نیچے ریگستان' کوئی لشکر اور فوج نہیں ہے اور ایران کی حکومت اس وقت کی سپر پاور ہے اور ایسے میں آپؐ پیشنگوئی فرماتے ہیں کہ اے سراقہ ایک دن آئے گا کہ کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔

غزوۂ خندق کا واقعہ اپنے ذہن میں تازہ کیجیے کہ ہزاروں کا لشکر مدینہ کو تباہ کرنے کے لیے پورے عرب سے اُمڈ آیا ہے۔ پشت پر یہودی چھرا گھونپنے کے لیے تیار تھے۔ کہیں سے بھی کوئی سلامتی کی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ لوگوں کے دل سینوں میں اُلٹ رہے تھے' حالات دیکھ کر حوصلے پست ہو رہے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی خندق نے مدینہ کو محفوظ کر رکھا تھا۔ ان حالات میں جب وہ خندق کھودی جا رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک تھے۔ ایک موقع پر ایک سخت چٹان پر گدال مارتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ مجھے قیصر کے خزانے دکھائے گئے ہیں۔ پھر دوسرا گدال چٹان پر مارا اور فرمایا کہ مجھے کسریٰ کے خزانے دکھائے گئے ہیں۔ ان حالات میں جب ہر طرف سے دشمن گھیرے میں لیے ہوئے تھا اور ذرا سی چوک سے مدینہ تباہ و برباد ہو سکتا تھا' اس وقت بھی آپؐ کی نظر عالمِ انسانیت کی امامت پر تھی اور جو منصب ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کیا گیا تھا' اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط

(البقرہ ۲:۱۲۴) ''میں تم کو سارے انسانوں کا امام بنانے والا ہوں''، وہی منصب سامنے تھا۔

یہ بات میں نے اتنی تفصیل سے اس لیے بیان کی ہے کہ تربیت میں جہاں ایک طرف نظر اس جنت پر ہونی چاہیے جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں اور اسی کی طرح اپنے آپ کو بنانا چاہیے، وہاں دوسری طرف دنیا کی منزل بھی سامنے رہنی چاہیے۔ سوچ میں، اعمال میں، برتاؤ میں، اخلاق میں وہی رویہ کارفرما ہونا چاہیے جو اہل جنت کی سوچ، اہل جنت کے اخلاق اور اہل جنت کے اعمال میں مطلوب ہے۔ نظر اور قلب میں وہی وسعت ہونی چاہیے جیسی کہ جنت کی وسعت ہے، اور فیصلوں میں وہی شادابی اور تازگی ہونی چاہیے جو جنت کی شادابی اور تازگی ہے، اور وہی سدابہار حوصلے اور محنتیں درکار ہیں کہ جس طرح سدابہار جنت کے پھل ہیں، اور اسی طرح کے ایمان اور اخلاق کی بہتی ہوئی نہریں ہونی چاہییں جو کہ جنت میں بہہ رہی ہوں گی۔ دنیا میں جب یہ سب کچھ ہوگا تب جا کر ہی جنت نصیب ہوگی اور دنیا کی امامت کی منزل سر ہوگی۔

دنیا کے اندر جو منزل ہے وہ کسی ضلع، گاؤں اور دیہات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ منزل تو اس ملک کو اور سارے عالم کو اس کے پیدا کرنے والے کے لیے مسخر کرنا ہے۔ کوئی آدمی جس کی صلاحیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، وہ گونگا ہو یا بہرہ، دیہاتی ہو یا اَن پڑھ، ہر ایک کو یہ سمجھنا چاہیے کہ میں اس قافلے میں شریک ہوں جو بالآخر اس سارے عالم پر غالب آنے والا ہے۔ اس سے ایک فرد کی سوچ اور صلاحیتیں پروان چڑھیں گی۔ اگر یہ مقصد واضح اور صاف ہو اور نگاہوں کے سامنے موجود ہو تو پھر اسی لحاظ سے آدمی کے اندر حوصلہ اور ہمت پیدا ہوگی اور تربیت اور عمل کے لیے جو محنت اور کوشش درکار ہے وہ کرنے کے قابل ہو سکے گا۔

تربیت کی بنیاد

تربیت کا انحصار نہ افراد کے جمع ہونے پر ہے، نہ تقریروں پر اور نہ دروس قرآن پر ہی ہے بلکہ تربیت کا انحصار ایک فرد کی اپنی ذات پر ہے۔ تربیت کی کنجی تقریروں میں یا دوسروں میں تلاش نہ کیجیے بلکہ وہ کنجی آپ کے دل میں ہے، آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر صرف گفتگوؤں اور تقریروں سے تربیت ہو جایا کرتی تو انبیا علیہ السلام کی اتنی موثر وعظ و نصیحتیں اور تقاریر رائیگاں

نہ جاتیں۔ جو لوگ نہ ماننا چاہتے تھے ان کو ایمان کی دولت بھی نصیب نہ ہوئی' اور جو لوگ کوئی کام نہ کرنا چاہتے تھے ان سے کوئی نیک عمل صادر نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حکمت کے تحت پیدا کر کے دنیا میں بھیجا ہے اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ ہم میں سے ہر شخص کو الگ الگ آزمانا چاہتا ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (الملک ۶۷:۲)' یعنی موت اور زندگی کی یہ ساری بساط بچھائی ہی اس لیے گئی ہے کہ وہ ہمیں آزما کر دیکھ سکے کہ ہم میں سے کون حسنِ عمل' نیک عمل کرتا ہے۔ نیکی ہی حسین ہوتی ہے۔ جس کے اعمال نیک ہوتے ہیں اسی کے اعمال حسین بھی ہوتے ہیں۔ یہی اس دنیا میں پیدایش کا مقصد ہے اور اس کے لیے اپنا ارادہ' اپنا عزم اور اپنی کوشش ہی وہ معیار اور ذریعہ ہے جس سے کسی کی تربیت ممکن ہے۔

اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی کے پاس جادو کی چھڑی ہو اور وہ ہلائے تو اس کے نتیجے میں تربیت ہو جائے اور ہم نیک بن جائیں' تو یہ جادو کی چھڑی اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو بھی نہیں عطا کی تھی۔ انبیا کو بھی محنت کرنا پڑتی تھی اور انبیا کی بات بھی وہی سنتے تھے کہ جو سننا چاہتے تھے۔ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (النمل ۲۷:۸۰) ''تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے''۔ اَفَاَنْتَ تَھْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ کَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ○ (یونس ۱۰:۴۳) ''مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انھیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟''

سیدنا مسیح علیہ السلام کے معجزات تو ایسے تھے کہ مفلوج چلنے لگتے تھے اور اندھے دیکھنے لگتے تھے اور کوڑھی اچھے ہو جایا کرتے تھے اور مٹی کے پرندے اڑنے لگتے تھے اور مردے زندہ ہو جایا کرتے تھے لیکن بنی اسرائیل کے وہ عوام' علما اور فقہا جو بیت المقدس میں آپ کی باتیں سن رہے تھے ان کے اندھے پن کا' ان کی بے عملی کا اور ان کی مفلوجیت کا کوئی علاج نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے خود اپنا علاج نہیں کرنا چاہا۔ اللہ تعالیٰ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت چاہتا ہے۔ اسی کی بہتری چاہتا ہے جو اپنی بہتری چاہتا ہے اور بہتری کے لیے کوشش کرتا ہے۔

جب تک اس نکتے کو نہیں سمجھا جائے گا کہ تربیت کا انحصار تقریروں' درس قرآن یا گفتگو پر نہیں ہے بلکہ تربیت کا انحصار ایک فرد کی اپنی ذات' مرضی اور ارادے پر ہے' تربیت نہیں ہو سکتی۔ تربیت کے عمل میں ایک شخص کی ذات کی حیثیت وہی ہے جو ایک کسان کے لیے کھیت کی ہوتی

ہے' ایک دکاندار کے لیے اس کی دوکان کی ہوتی ہے اور ایک تاجر کے لیے اس کے کاروبار کی ہوتی ہے۔ ایک کسان خوب جانتا ہے کہ گھر بیٹھ کر دعا کرنے سے یا کسی اور کے دعا دینے سے یا آسمان سے بارش کے برسنے سے فصل نہیں اگے گی۔ وہ ہل لے کر نکلے گا' ہل چلائے گا' بیج بوئے گا' اس کی نگہداشت کرے گا' تب جا کر پانی بھی فائدہ دے گا' سورج بھی گرمی پہنچائے گا' بیج بھی نشوونما پائے گا' درخت بھی نکلے گا اور پھل بھی آئیں گے۔ اس محنت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوگا۔ اس کو اپنے کھیت کی ذمہ داری خود سنبھالنا پڑے گی۔ تب کہیں جا کر کھیت اس کو فصل دے گا۔ دکان دار بھی جانتا ہے کہ وہ اگر دکان پر تالا ڈال کر گھر بیٹھا رہے تو کسی چھومنتر سے دکان کھل کر اس کو نفع نہیں دے گی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے۔ اس کو دکان کھولنا ہی پڑے گی' صبح سے شام تک مال بیچنا پڑے گا' خون پسینہ ایک کرنا پڑے گا' تب کہیں جا کے چار پیسے کھرے ہوں گے۔

اسی طرح یہ دکان جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت میں لگا دی ہے اور یہ کھیتی جو اس نے آپ کو اپنی روح اور اخلاق کی دی ہے' اس کو سینچنے کی ذمہ داری آپ کو خود اٹھانا پڑے گی۔ جب آپ یہ عزم کریں گے کہ اللہ نے مجھ کو وہ کچھ بخشا ہے کہ جس کی اگر میں تربیت کروں تو وہ اس لائق ہوسکتا ہے کہ ملائکہ سے بھی اوپر جا کر اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ منزل موجود ہے' وہاں پہنچنا بھی مشکل نہیں ہے لیکن پرواز خود کرنا پڑے گی۔ اگر میرے اندر حوصلہ اور ہمت نہیں ہے تو میں منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ جنت بھی میرے نصیب میں آسکتی ہے جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائے' اور امامت عالم کا وہ منصب کہ جہاں دنیا کی ساری طاقتیں اسلام کے مقابلے میں سرنگوں ہو جائیں وہ بھی میرے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی بغیر محنت اور کوشش کے مجھے نہیں مل سکتی۔

ایک طرف اگر آپ کے سامنے منزل ہو اور دوسری طرف آپ کو اس امکان پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے ہوں گے اور تیسری طرف اگر آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ نہ تقریروں سے تربیت ہوتی ہے نہ درس قرآن سے اور نہ تربیت گاہ سے ہی تربیت ہوتی ہے بلکہ تربیت صرف اپنے عمل اور کوشش سے ہوتی ہے' تو آپ تربیت کی کنجی کو پالیں گے۔ اس کے بعد تقاریر' درس قرآن' تربیت گاہیں اور ماحول اس کھاد' پانی اور روشنی کی طرح کام کرتے

ہیں جس سے بیج کو پروان چڑھایا جاسکتا اور تربیت کے عمل کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کوشش ہی نہ کریں' بیج ہی نہ ڈالیں' اس کی نگہداشت نہ کریں تو پھر پانی' کھاد' زمین کتنی ہی زرخیز کیوں نہ ہو' سونا اگلنے والی ہی ہو' وہ آپ کو کچھ نہیں دے گی۔

ہر شخص کے اندر اللہ تعالیٰ نے سونا اُگلنے والی مٹی رکھی ہوئی ہے جیسا کہ میں نے مثال دی کہ عرب کے بدو معمولی انسان تھے لیکن دنیا کے قائد بن گئے۔ جو اَن پڑھ تھے' اُمّی تھے' ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو بہترین جرنیل' حکمران' علما اور جج اور فقہا ثابت ہوئے۔ مدینہ کی درس گاہ سے وہ لوگ بن کر نکلے کہ جنھوں نے سارے عالم پر حکومت کی اور ہزاروں برس تک دنیا کی رہنمائی کی۔ ان میں قیادت کی صلاحیت موجود تھی لیکن وہ اپنی صلاحیتوں سے بے خبر تھے۔ جس طرح ایٹم کا چھوٹا سا ذرّہ نہیں جانتا کہ اس کے اندر کتنی بڑی قوت پوشیدہ ہے۔ جب ایٹم کا وہ معمولی ذرّہ خود سے آگاہ ہو جاتا ہے یا کوئی دوسرا اس کو آگاہ کر دیتا ہے تو وہی اتنی بڑی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ ایٹم بم بن کے لاکھوں انسانوں کو ایک سیکنڈ میں تباہ کر سکتا ہے اور لاکھوں کلوواٹ کی قوت پیدا کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اندر وہ امکانات موجود ہیں کہ وہ بہت اونچا اڑ سکتا ہے' بہت اونچی پرواز کر سکتا ہے اور وہ ساری منازل طے کر سکتا ہے جو منازل اللہ نے انسان کے لیے کھول دی ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ لیکن یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ میرے کرنے سے ہی ہوگا۔

اگر ایک شخص محض خواہش ہی کرتا رہے' تمنا ہی کرتا رہے' دعا کرتا رہے اور دوسروں سے دعاؤں کی درخواست کرتا رہے اور یہ سوچے کہ تمناؤں اور آرزوؤں سے کام چل جائے گا تو یہ خام خیالی ہے۔ اس سے کام نہیں ہوگا۔ اصل چیز عمل ہے۔ عمل کم ہو یا زیادہ' عمل سے ہی زندگی بنتی ہے' جنت بھی جہنّم بھی۔ جب آپ کچھ کرنے پر لگ جائیں گے خواہ تھوڑا کریں' تو تھوڑا تھوڑا کر کے بہت ہو جاتا ہے۔ قطرہ قطرہ کر کے دریا بن جاتا ہے' ذرہ ذرہ مل کر ریگستان بن جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے آپ نیک اعمال اختیار کرلیں گے اور ایک ایک کر کے اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرلیں گے۔ البتہ یہ سب کچھ خود کرنے سے ہوگا۔ اگر خود کام نہیں کریں گے تو

کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ تربیت کا بڑا اہم پہلو ہے جو ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔

ترجیحات کا مسئلہ

تربیت کے عمل میں ایک اہم پہلو ترجیح' ایثار اور قربانی کا ہے۔ یہ دین کی راہ میں اور تربیت میں بڑا بنیادی عمل ہے۔ انسان کی پوری زندگی اسی چیز میں بسر ہوتی ہے کہ مختلف چیزیں انسان کی توجہ' اس کے مال' اس کے عمل اور اس کی محنت کی طلب گار ہوتی ہیں۔ اب اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کسے ترجیح دے اور کسے رد کرے۔ نیکی اور بدی ایک ساتھ آ جائیں تو کسے اختیار کرے؟ دو چیزیں وقت مانگتی ہیں' کس کو وقت دیا جائے؟ بعض دفعہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوتی ہیں جہاں یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ سردیوں کی صبح ہے' گرم گرم بستر ہے' موذن کی آواز بلند ہو جاتی ہے' اب یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ گرم بستر چھوڑ دوں اور رب کی پکار پر لبیک کہوں یا سوتا پڑا رہ جاؤں۔ گھر میں کسی کام میں مشغولیت ہے' اذان کی آواز آ جاتی ہے' یہاں بھی ترجیح کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ نماز کے ذریعے پانچ وقت اسی چیز کی تربیت ہوتی ہے۔

اس طرح ترجیح' ایثار اور قربانی کا یہ عمل ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اسی ترجیح کی بنا پر انسان کو اپنے بہت سے سارے رشتہ دار' اپنے تعلقات اور بعض دفعہ اپنا ذاتی مفاد تک قربان کرنا پڑتا ہے۔ البتہ ترجیحات کے اس عمل میں ہمیشہ ترجیح اس کام کو دی جانی چاہیے جس میں اللہ کی رضا ہو اور جس سے دنیا میں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات حصے میں آتے ہوں۔ اسی کو ترجیح دینا چاہیے اور اسی کے پیچھے اپنے آپ کو لگانا چاہیے۔

اپنی منزل کی طرف جستجو' مختلف امور پر مختلف امور کو ترجیح دینا' اسلام میں بہت ساری عبادات میں اس کی تربیت دی گئی ہے۔ پانچ وقت نماز میں اسی بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ سارا کام چھوڑ کر نکل جاؤ' اللہ کے گھر تک جاؤ' نماز ادا کرو اور واپس آ جاؤ۔ یہ اپنی ذات پر اور اپنے مفاد پر خدا کے حکم کو ترجیح دینا ہے اور اس کی تربیت ہے۔ نماز تو گھر میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گھر میں' تنہائی میں' یا کسی گوشے میں کھڑے ہو کر نماز ادا کی جائے تو مسجد کے مقابلے میں شاید زیادہ خشوع وخضوع ہوتا اور زیادہ توجہ ہوتی۔ گھر میں پڑھی جانے والی

نماز کے مقابلے میں مسجد میں نماز کی ادایگی ۲۷ درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ مسجد میں شاید خشوع وخضوع میں کمی آجاتی ہو لیکن یہ تربیت کہ آدمی اللہ کی پکار پر لبیک کہے اور سب کچھ چھوڑ کے نکل کھڑا ہو' سارے کاروبار ترک کر دے اور اللہ کی پکار پر حاضر ہو جائے' نماز باجماعت اور مسجد میں آئے بغیر ممکن نہیں۔ سورۂ جمعہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (الجمعہ ۶۲:۹)''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو''۔

اللہ کو یاد کرنا' تنہائی میں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرنا اپنی جگہ فضیلت رکھتا ہے اس کے لیے اور مقامات ہیں۔ لیکن اللہ کی پکار پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد کی طرف دوڑ پڑنا اور سارا کاروبارِ زندگی ترک کر دینا' یہ اصل چیز ہے جو مطلوب ہے اور نماز کے ذریعے اس کی بار بار یاد دہانی اور تربیت کی جاتی ہے۔ جب آپ گوشے میں کھڑے ہیں تو کوئی چیز قربان نہیں کر رہے ہیں لیکن جب آپ گھربار چھوڑ کر نکلتے ہیں تو آپ قربانی دیتے ہیں اور اصل چیز تو یہ ترجیح' ایثار اور قربانی ہی ہے جس سے شخصیت بنتی ہے۔

صبح سے شام تک بارہا اس سوال کا سامنا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے' کسے ترجیح دی جائے اور کسے نہ دی جائے' یہ کیا جائے اور وہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح یہ پہلو کہ غصہ آرہا ہے یہ بات منہ سے نکالنی چاہیے یا نہیں' یہ وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرنے میں میرا یہ نقصان ہوتا ہے وعدہ پورا کروں یا نہ کروں' سچ بولوں تو یہ نقصان ہوگا اور جھوٹ بولوں تو یہ فائدہ' آیا سچ بولوں یا جھوٹ' اگر ملکی انتخابات ہیں ترجیحات کا مسئلہ پیش آتا ہے کہ کس کا ساتھ دیا جائے۔ گویا قدم قدم پر یہ مسئلہ پیش آتا ہے۔ عملاً تربیت یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ آپ بہت ساری چیزوں کو ترک کرتے ہیں اور یہ تربیت مسلسل ہوتی ہے۔

حج کی تربیت بھی یہی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر آدمی جا[illegible] ایک پتھر کے گھر کے گرد چکر کاٹتا ہے اور ایک میدان میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور واپس آجاتا ہے۔ حج کا خلاصہ جو میں نے بیان کیا ہے' اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ حج کے اندر کوئی چیز کرنا یا پڑھنا ضروری' لازمی یا ناگزیر نہیں ہے کہ جس کے بغیر حج نہ ہو سکے۔ یہ سب کس لیے ہے' اسی لیے کہ اللہ کی راہ

میں نکلو اور اس کی پکار پر لبیک کہو اور اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ دو، گھر بھی چھوڑ دو، رشتہ داروں کو بھی چھوڑ دو، لباس بھی بدل لو، سفر کرو، اس کے گھر تک آؤ۔ اللہ ہی کو اپنا محبوب سمجھو، اسی کے لیے اس کے گھر کے گرد چکر لگاؤ، اسی کے دربار میں حاضری دو اور اسی کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ یہی دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق، دین کی خاطر جدوجہد اور اس کے لیے قربانی کی تربیت ہے۔

باھمی تعلق اور ماحول سے تربیت

انسان تنہا نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی تو بنتی ہی دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق کے نتیجے میں ہے۔ بیوی بچے، ماں باپ، بھائی بہن، دوست احباب اور رشتہ داروں کے ساتھ مختلف تعلق ہیں جن پر انسانی زندگی محیط ہے۔ دراصل انسان کا امتحان ہی یہی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق میں عدل اور احسان کے اوپر قائم رہے۔ دوسروں کے حقوق پورے پورے ادا کرے۔ اگر کسی کے ساتھ بات کرے تو بہترین بات کرے، یا بھلی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔ اگر کسی کے ساتھ معاملہ کرے تو انصاف کا معاملہ کرے، احسان کا معاملہ کرے۔ اپنی ذات سے کسی انسان کو ایذا نہ پہنچائے۔ راستے میں اگر کوئی ایذا پہنچانے والی چیز ہو تو اس کو بھی ہٹا دے۔ اس پر بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اگر کسی کتے کو پیاسا دیکھیں اور اس کو پانی پلا دیں تو اس پر بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں بلّی کو آدمی بھوکا مار دے تو اس پر جہنّم کی وعید سنائی گئی ہے۔

باہم مل جل کر رہنے میں، تعلق، رشتہ داری اور حقوق کی ادایگی میں ناگواریاں ہو سکتی ہیں اور تلخیاں بھی۔ مگر یہ سب صبر کرنے، محبّت کرنے، ایک دوسرے سے قریب آنے کی تربیت کا ایک ذریعہ اور موقع ہے جو درس و تقریر سے الگ ہٹ کے میسر آ سکتی ہے۔

اسی طرح اپنے ماحول سے آدمی سیکھتا ہے۔ باہم ملنے جلنے سے، چلنے پھرنے سے بہت سی باتیں ایسی سامنے آتی ہیں جو آدمی کو ناپسند ہوں اور بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو پسندیدہ ہوں۔ اس میں بھی انسان کا امتحان ہوتا ہے اور اس میں دین نے جو اصول سکھائے ہیں، باہمی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں ان کی آزمایش ہوتی ہے کہ اگر آدمی کسی برائی کو دیکھے تو

کس طرح اس کی اصلاح کرے اور اگر اچھائی دیکھے تو کس طرح اس کی تحسین کرے۔

کوئی انسان مثالی انسان نہیں ہو سکتا سوائے اللہ کے رسولوں کے۔ کوئی بستی مثالی بستی نہیں ہو سکتی سوائے جنت کی بستی کے۔ اس لیے آپ جہاں جہاں بھی انسانوں کے اندر چلیں گے' پھریں گے آپ کو اچھائیاں بھی دکھائی دیں گی اور خرابیاں بھی ملیں گی۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان سب کے ساتھ جینا اور ان سب کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ ان کی اصلاح کی کوشش کرنا آپ پر فرض ہے۔ یہ بھی تربیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تربیتی ذرائع کی اھمیت

جہاں تک تعلق تقاریر' درس قرآن اور لٹریچر وغیرہ کا ہے تو وہ خود تو کسی انسان کی تربیت نہیں کرتے بلکہ یہ ایک ذریعہ ہیں۔ ان کی مثال بارش کی سی ہے۔ جب بارش برستی ہے تو کھیت بھی اس سے سیراب ہوتے ہیں اور کنوؤں کے اندر بھی پانی ذخیرہ ہوتا ہے اور تالابوں کے اندر بھی اور بہت سی جگہوں پر پانی کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سیراب وہی ہوگا جو اس کو اپنے اندر جذب کرے' محفوظ کرے۔ درس قرآن اور تقاریر سے بھی تب ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کو اپنے ذہن' دماغ اور سینوں میں محفوظ کیا جا سکے۔ جو باتیں قابلِ عمل ہوں ان سے فائدہ تب حاصل کیا جا سکتا ہے' جب ان پر نگاہ رہے۔ تقریر فی نفسہ آپ کو فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ اگر آپ خود فائدہ حاصل کرنا چاہیں گے تو پھر وہ سارے فوائد آپ کے استفادے کے لیے موجود ہوں گے جو تقریر کے اندر پائے جاتے ہیں۔

یہ تربیت سے متعلق کچھ بنیادی باتیں ہیں۔ اگر آپ انھیں ملحوظ رکھیں' اپنے ذہن میں تازہ رکھیں اور عمل کی کوشش کریں تو مجھے امید ہے کہ یہ باتیں ان شاءاللہ آپ کے لیے برکت کا' بہتری کا اور نشوونما اور ارتقا کا ذریعہ بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

(کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قیامت کے دن آدمی کے پاس اس کا کھلا ہوا نامۂ اعمال لایا جائے گا' (وہ اس کو پڑھے گا)' پھر کہے گا: اے میرے رب! میں نے دنیا میں فلاں فلاں نیک کام کیے تھے۔ وہ تو اس میں نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ جواب دے گا: لوگوں کی غیبت کرنے کی وجہ سے وہ نیکیاں تمھارے نامۂ اعمال سے مٹا دی گئی ہیں۔

(ترغیب و ترهیب)

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ

پروفیسر خورشید احمد

کہا جاتا ہے کہ یہ زندگی اور یہ دنیا فرق و امتیاز کی جگہ ہے اور جب انسان' عالمِ زیست کی حدوں سے گزر جاتا ہے تو موت سب کو برابر کر دیتی ہے--- بے بسی کہ دوسروں کے کاندھوں پر انحصار' لباسِ افتخار سب رخصت اور دو سادہ کپڑوں میں امیر و غریب سب کا آخری سفر' اور محلات اور جھونپڑے سب ختم' دو گز زمین اور منوں مٹی تلے بسیرا سب کا مقدر۔ بات سچّی ہے لیکن ایک پہلو ایسا بھی ہے جس میں فرق و امتیاز باقی رہتا ہے اور اس کا بھرپور اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ دوسرے اس موت کو کس طرح دیکھتے ہیں' اس غم کو کس طرح محسوس کرتے ہیں اور جنازے کے آئینے میں رخصت ہونے والے کی تصویر کیا نقش چھوڑتی ہے۔

شیخ یوسف القرضاوی نے بڑی خوب صورت بات کہی تھی کہ کچھ جنازے استصواب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ خلقِ خدا اپنے خدا کے سامنے جانے والے کے بارے میں کیا شہادت پیش کرتی ہے۔ کراچی نے جو منظر ۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ء کو مولانا شاہ احمد نورانی کی نمازِ جنازہ میں دیکھا' وہ ایک عوامی استصواب سے کم نہ تھا۔ شاید قائداعظمؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے جنازے کے بعد اتنا بڑا اصلوٰۃِ جنازہ کا نظارہ کراچی کی زمین پر نہیں دیکھا گیا۔ اس میں جوان اور بوڑھے' عالم اور عامی' امیر اور غریب' خادم اور مخدوم اور سب سے بڑھ کر ہر مسلک اور ہر مذہبی اور سیاسی رجحان سے وابستہ افراد کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ مرحوم کی مقبولیت اور خلقِ خدا کی ان سے محبت اور عقیدت کا منہ بولتا ثبوت' ان کی خدمات کا اعتراف اور ان کے

رتبے اور مقام کا اظہار تھا۔ سچ ہے ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے' اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم متحدہ مجلسِ عمل کے صدر' جمعیت علماے پاکستان کے قائد' ورلڈ اسلامک مشن کے سربراہ' ایک ممتاز عالمِ دین اور شہرہ آفاق مبلغ اور داعی تھے۔ سینیٹ آف پاکستان میں متحدہ حزب اختلاف کے قائد اور عملاً ایوان میں لیڈر آف دی اپوزیشن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو سینیٹ کے اجلاس اور متحدہ حزبِ اختلاف کی پریس کانفرنس میں شرکت کی۔ ہنستے بولتے رخصت ہوئے کہ ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ۱۲ بجے دن ایک اور پریس کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ کسے خبر تھی کہ اس وقت جب انھیں اس پریس کانفرنس میں شرکت کے لیے سینیٹ آنا تھا فرشتۂ رحمت رفیقِ اعلیٰ سے ملاقات کا پروانہ لے کر آجائے گا اور ایک ابدی سفر کی طرف ان کو لے جائے گا۔ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے وہ اپنے مالک سے جا ملے--- اناللّٰہ وانا الیہ راجعون!

مجھے حضرت شاہ احمد نورانیؒ سے ملنے کا پہلا موقع غالباً ۵۳-۱۹۵۲ء میں نصیب ہوا جب ان کے برادرِ نسبتی اور میرے محترم اور مشفق بزرگ (جو مجھے چھوٹے بھائی کا درجہ دیتے تھے) ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری کی معیت میں ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ میرا طالب علمی کا دور تھا۔ وائس آف اسلام جمعیت الفلاح کا انگریزی مجلہ تھا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری اس کے مدیر تھے' کمالِ شفقت سے انھوں نے وجودِ باری تعالیٰ پر میرا مضمون مجلّے میں شائع کیا تھا۔ اس مجلّے کے ذریعے مجھے برادر محترم فضل الرحمٰن انصاری سے قرب حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انھی کے توسط سے سنگاپور سے شائع ہونے والے مجلہ Al-Islam سے واقفیت ہوئی جو حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ کی سرپرستی میں نکلتا تھا اور شاید اس دور میں انگریزی میں دعوتِ اسلامی کا بہترین ترجمان تھا۔ اسی مجلّے سے عظیم مبلغ حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب کی تحریروں اور سرگرمیوں سے واقفیت ہوئی تھی اور ملنے کا شوق تھا۔ پس یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی کا انتقال غالباً ۱۹۵۴ء میں ہوا اور

پھر ان کے مشن کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری اور مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنے اپنے انداز میں جاری رکھا۔

انگلستان میں قیام کے دوران مولانا شاہ احمد نورانی کی عالمی تبلیغی سرگرمیوں سے زیادہ گہری واقفیت ہوئی۔ وہ اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر تشریف لائے اور بڑی شفقت سے ہمارے کام کی تحسین فرمائی۔ اسلام آباد میں بھی انتقال سے چند ماہ قبل اصرار کر کے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تشریف لائے اور اپنی دعاؤں سے نوازا۔ بیرون ملک بھی، خصوصیت سے لندن میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں لیکن سچّی بات ہے کہ زیادہ قریب سے ان کو دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملی یکجہتی کونسل کے قیام کے بعد حاصل ہوا، اور پھر گذشتہ پورا سال تو اس طرح گزرا کہ سینیٹ اور متحدہ مجلسِ عمل کے کاموں کے سلسلے میں دن رات ان کے ساتھ رہنے اور مل کر کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کی شفقت، محبت، معاملہ فہمی، نرم گفتاری کے نقوش دل پر مرتسم ہیں اور یہ کہنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ ہر روز ان سے تعلّق کو گہرا کرنے کا باعث ہوا۔ ان کے رخصت ہونے سے نہ صرف قومی زندگی بلکہ ہماری ذاتی زندگیوں میں بھی ایک خلا واقع ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کے جاری کردہ اچھے کاموں میں مزید برکت اور افزونی پیدا کر دے۔ آمین!

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ (اپریل ۱۹۲۶ء) میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کیا اور ۱۰ سال کی عمر سے تراویح میں باقاعدگی سے قرآنِ پاک سناتے رہے حتیٰ کہ آخری بار اِسی سال ختمِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ بقول مولانا نورانی اس پورے عرصے میں صرف دو سال بیماری کے باعث ختمِ قرآن نہ کر سکے۔ گویا ۶۵ سال قرآن سنایا...... سبحان اللہ! جزاھم اللّٰہ خیر الجزاء۔ تعلیم عربک کالج میرٹھ اور الٰہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء سے والد مرحوم کے ساتھ تبلیغی سرگرمیوں میں شرکت کی اور غیر مسلموں تک اسلام کے پیغام کو پہنچانے کے ساتھ ساتھ عیسائی پادریوں اور قادیانی مبلغوں سے مناظروں کا اہتمام بھی کیا اور کئی ہزار افراد کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۷۰ء میں سیاست میں قدم رکھا اور کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۷۷-۱۹۷۲ء والی اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی تدوین اور ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے والی متفقہ قرارداد کی منظوری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظامِ مصطفیٰؐ میں ان کا مقام صفِ اول میں تھا۔ اس جدوجہد میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۷۷ء میں سینیٹ میں منتخب ہوئے اور پھر دوبارہ ۲۰۰۳ء میں ایم ایم اے کے سربراہ کی حیثیت سے سینیٹ میں منتخب ہوئے۔ ۵۰ سے زائد ملکوں کا دورہ کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی ایک جید عالم' ایک بالغ نظر مبلغ' ایک باکردار سیاسی قائد اور مدبر اور اسلامی اتحاد اور ملّی وحدت کے نقیب اور اس کی علامت تھے۔ جس حکمت' شفقت اور حسن تدبیر سے انھوں نے پاکستان کے مختلف دینی مکاتب فکر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور انصاف اور اعتدال کے ساتھ ان کی قیادت فرمائی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے جو آنے والوں کے لیے بھی ایک تابناک مثال رہے گا ؏

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اخبارِ اُمت

صدام کی گرفتاری

پروفیسر خورشید احمد

سقوطِ بغداد (۹ اپریل ۲۰۰۳ء) کے بعد صدام کی گرفتاری یا موت کی خبر کسی وقت بھی متوقع تھی اور یہ امریکہ کے لیے باعثِ خفت ہے کہ ''فتح'' کے آٹھ مہینے کے بعد اسے یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ "We got him" (ہم نے اسے پکڑ لیا!)۔

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مخبری یا صدام کے اپنے محافظوں کی بے وفائی کے سبب امریکہ اس تک پہنچ سکا اور اسے پہلے نشہ زدہ کیا گیا اور پھر گرفتاری کے ڈرامے کو ٹیلی وژن کے اسکرین پر دکھایا گیا۔ یہ بھی معنی خیز ہے کہ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو گرفتاری کے اعلان سے ایک ہفتہ پہلے جنگی جرائم پر مقدمہ چلانے کے لیے عراقی ججوں پر مشتمل عدالت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ گویا یہ سب اسی ڈرامے کی مختلف کڑیاں ہیں اور ہر منظر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دکھایا جا رہا ہے۔

امریکہ نے صدام کو 'جنگی قیدی' (prisoner of war) قرار دیا ہے اور وہ قابض فوجوں کی تحویل میں ہے۔ ہمیں صدام کی ذات سے کوئی دل چسپی نہیں اور اس نے جو کچھ کیا' اس کی سزا وہ اللہ کے قانونِ مکافات کے مطابق یہاں اور آخرت میں ضرور بھگتے گا--- جس میں وہ ذلت بھی شامل ہے جو اس کا مقدر ہوگئی ہے۔ لیکن یہ گرفتاری اور جس طرح اس کی تشہیر کی گئی ہے وہ امریکہ کے کردار کو سمجھنے کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر امریکہ ایک مہذب

ملک ہے تو وہ بھی بین الاقوامی قانون کا اسی طرح پابند ہے جس طرح دنیا کے دوسرے ممالک۔ لیکن امریکہ خود کو ہر قانون اور ضابطے سے بالا سمجھتا ہے اور ان تمام قوانین اور معاہدات بشمول جنیوا کنونشنز کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا جو اسے جنگ اور جنگی قیدیوں کے باب میں کسی درجے میں بھی پابند کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران جب عراق نے امریکہ کے جنگی قیدیوں کو ٹی وی پر دکھایا تھا تو امریکہ چیخ اُٹھا تھا کہ یہ جنیوا کنونشنز کے خلاف ہے۔ لیکن خود امریکہ نے جس طرح سے صدام کے بیٹوں کی لاشوں کی نمایش کی اور اب جس حقارت کے ساتھ صدام کو بہ این ریش دراز دکھایا، شیو کیے جانے اور دانتوں سے ڈی این اے حاصل کرنے کے مناظر کو پیش کیا اور چوہے کے بل کی داستانیں نشر کیں، انھیں بھلا کون سے قانون یا ضابطے کے تحت جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

قیدیوں کی تحقیر ایک مذموم حرکت اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے لیکن امریکہ کے لیے یہ سب روا ہے۔ اس نے تو اقوامِ متحدہ کے قائم کردہ جنگی جرائم کی کورٹ کو تسلیم کرنے تک سے انکار کر دیا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک سے دوطرفہ معاہدات کر رہا ہے کہ امریکہ کے فوجی بین الاقوامی کریمنل کورٹ کی دسترس سے باہر رہیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امریکہ ایک مہذب ریاست کا نہیں بلکہ ایک غنڈا ریاست (Rogue State) کا کردار ادا کر رہا ہے اور طاقت کے نشے میں چور، خود کو ہر قانون سے بالا رکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ ایک عالمی لیڈر کا نہیں ایک Master اور Bully کا کردار ادا کر رہا ہے اور دنیا کی نگاہ میں اب امریکہ کی یہی پہچان ہے۔ پھر اگر دنیا کے لوگ امریکہ کو امن کے لیے خطرہ اور خود اپنے لیے ایک ناپسندیدہ کردار تصور کرتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور؟ اس کے بعد بھی اگر صدر بش یہی پوچھتے ہیں اہل دنیا ہم سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ؏

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

دوسرا پہلو، جس میں عرب اور مسلمان ممالک اور ان کی قیادتوں کے لیے بھی بڑا سامانِ عبرت ہے اور خود امریکہ کے لیے بھی، یہ ہے کہ اب اس پر بحث ہو رہی ہے کہ صدام پر مقدمہ کیسے چلایا جائے؟ اس لیے کہ اگر یہ کھلا مقدمہ ہوا اور صدام سارا کچا چٹھا عدالت کے سامنے

رکھ دے تو صدام کے جرائم سے کہیں زیادہ خود امریکہ کے جرائم اور گھناؤنے کردار کا نقشہ دنیا کے سامنے آئے گا اور معلوم ہوگا کہ امریکہ عرب، مسلم اور تیسری دنیا کے ممالک میں کیا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ صدام نے ۱۲ ہزار صفحات پر مشتمل جو دستاویز عام تباہی کے ہتھیاروں کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کو دی تھی امریکہ نے اس میں سے ۹ ہزار صفحات پر masking tape لگا دیا تھا کہ اس میں اس کے اپنے کردار کا ذکر تھا۔ اب یہ سب چیزیں کھل کر دنیا کے سامنے آئیں گی۔

اس کے علاوہ صدام کو صدام بنانے میں امریکہ نے کیا کردار ادا کیا ہے یہ بھی دنیا کے سامنے آرہا ہے۔ رچرڈ سیل (Richard Sale) کی ایک تحقیقی رپورٹ کے بموجب جو اس سال اپریل میں یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل نے شائع کی ہے کہ امریکی سی آئی اے کا پہلا رابطہ نوجوان صدام حسین سے ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا جو عراق کے مقبول عوام حکمراں جنرل عبدالکریم قاسم کو قتل کرنے کے منصوبے کے سلسلے میں تھا۔ جنرل عبدالکریم قاسم وہ شخص تھا جس نے عراق کی مغرب نواز شہنشاہیت کا تختہ الٹا تھا اور عراقی قوم پرستی اور اشتراکیت کے نظریے پر استوار بعث پارٹی کے ذریعے امریکہ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ عرب محقق اور تجزیہ نگار عادل درویش کی کتاب *UNHOLY BABYLON: The Secret History of Saddam's War* میں پوری دستاویزی شہادتوں کے ساتھ صدام اور بعث پارٹی کے گھناؤنے کردار اور ان کے سی آئی اے سے تعلقات کی تفصیلات آچکی ہیں اور خود بعث پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے اعتراف کیا تھا کہ "We came to power on CIA train" (ہم امریکی گاڑی پر سوار ہوکر اقتدار میں آئے تھے)۔ اس گاڑی میں صدام حسین کا ایک خاص مقام تھا، یعنی پارٹی کی خفیہ جاسوسی تنظیم کی سربراہی۔ پارٹی کا یہی وہ عنصر تھا جو *Iraqi National Guardsmen* کے عنوان تلے سیاسی مخالفین اور سی آئی اے کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق لوگوں کو چن چن کر قتل کر رہا تھا۔

صدام سی آئی اے ہی کے تعاون سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا بالآخر عراق کا مطلق العنان فرمانروا بنا اور اس حیثیت سے ہی وہ امریکہ کا منظورِ نظر تھا خاص طور پر جب امریکہ نے

اسے ایران کے خلاف استعمال کیا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے عراق پر بھی دوسرے عرب ممالک کی طرح پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایران کے خلاف جنگی خدمات کے عوض ۱۹۸۲ء میں صدر ریگن نے وہ پابندیاں اٹھائیں اور صدام کو صرف معلومات ہی نہیں بلکہ اسلحہ' کیمیاوی اور گیس کے ہتھیار اور ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد بھی دی۔ اور وہ امداد اس کے علاوہ ہے جو سعودی عرب اور کویت سے دلوائی گئی۔ موجودہ سیکرٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ جو اُس وقت ریگن کے نمایندے کے طور پر ۲۰ دسمبر ۱۹۸۳ء کو صدام سے ملے اور اسے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں بغداد کا دورہ کیا اور جس وقت صدام کردوں کے خلاف زہریلی گیس استعمال کر رہا تھا جو امریکہ' برطانیہ اور جرمنی سے فراہم کی گئی تھی' تب کھلے عام امریکہ اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔ یہ اور سارے حقائق ویسے تو اب کسی نہ کسی طرح سامنے آچکے ہیں لیکن امریکہ خائف ہے کہ صدام کے مقدمے کے ذریعے سے یہ ساری کالک اس کے منہ پر ملی جائے گی۔ اس لیے وہ بین الاقوامی مقدمے سے کنی کترا رہا ہے اور صدام کی سرپرستی کے اپنے گھناؤنے کردار کے اس طرح طشت از بام ہونے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

صدام کی گرفتاری سے امریکہ کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اس میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ عراق میں امریکی قبضے کے خلاف جو تحریک برپا ہے اس میں کمی کا امکان نہیں اور صدام کی گرفتاری سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ اس کی پشت پر صدام نہیں (وہ تو ایک تہہ خانے میں پناہ لیے ہوئے تھا اور منشیات کے ذریعے اپنے غم غلط کرنے میں مصروف تھا)' بلکہ پوری قوم ہے اور محض صدام یا القاعدہ کی دہائی دے کر اس کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

عالمِ اسلام کے لیے بھی اس میں عبرت کا مقام ہے کہ کس طرح وہ قائدین جو اس پر مسلط ہیں' وہ دوسروں کے آلہ کار رہے ہیں اور ہیں' اور وہ جو اپنے عوام پر ظلم ڈھانے کے لیے بڑے جری ہیں جب آزمایش آتی ہے تو کس طرح چوہوں کی طرح بلوں میں گھستے اور اپنی جان بچاتے نظر آتے ہیں۔ اس میں یہ سبق بھی ہے کہ وہ نظام جس میں باگ ڈور ایسے آمروں کے ہاتھ میں ہو' کتنا کمزور اور بودا ہوتا ہے اور کس طرح تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح زمین بوس ہوجاتا ہے۔ استحکام' دستور اور قانون کی حکمرانی' اصولوں کی بالادستی اور اداروں کے

استحکام سے حاصل ہوتا ہے۔ آج ہماری کمزوری کی اصل وجہ ہی اجتماعی نظام کا یہ بگاڑ اور اجتماعی احتساب کا فقدان ہے۔ خود اپنے گھر کی اصلاح وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بات صرف عراق اور صدام کی نہیں، ہر مسلمان ملک اور وہاں پر مسلط ہر آمر کا مسئلہ ایک ہی ہے۔ نام اور جگہ مختلف ہے۔ اگر مسلم عوام یہ سبق سیکھ لیں اور اپنے معاملات ان باہر سے مسلط کیے جانے والے نام نہاد مسیحاؤں کے ہاتھوں سے لے کر خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو چند سالوں میں زندگی کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!



ملت کی خدمت کیلیے | صلاحیتوں میں نکھار کیلیے | شخصیت کی تعمیر کیلیے | روشن مستقبل کیلیے

جامعہ اسلامیہ جدیدہ

فیصل ٹاؤن وہاڑی

سرپرست: شیخ القرآن والحدیث حضرت
مولانا عبدالمالک مدظلہ، ایم این اے

صدر: امیر جماعت اسلامی ضلع وہاڑی
چودھری محمد طفیل وڑائچ

جماعت اسلامی کا مثالی تعلیمی، تربیتی اور اقامتی ادارہ

- اپنی اور اپنی اولاد کی عاقبت سنوارنے کے لیے انھیں نظریاتی کارکن/علماء دین بنانے کی فکر کیجیے۔ آج یہ آپ کے اختیار میں ہے، دیکھنا! کل کہیں پچھتانا نہ پڑے۔
- جامعہ کا مقصد اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل ایسے نوجوان علماء دین تیار کرنا ہے جو کہ اسلامی علوم کے مستند ماہرین ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر بھی دسترس رکھتے ہوں اور جو فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی نظامِ زندگی کے احیاء و قیام (فریضہ اقامت دین) کے لیے ملک و قوم کی خدمت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔
- پرائمری کے بعد گیارہ سالہ اور مڈل کے بعد آٹھ سالہ نصاب تعلیم، ایم اے عربی/اسلامیات کے مساوی فاضل درس نظامی اور دورہ حدیث کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مروجہ جدید تعلیم
- طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار کے لیے تعصب سے پاک بہترین ماحول، تمام طلبہ کے لیے مفت تعلیم اور طبی سہولیات جب کہ مستحق اور یتیم طلبہ کے لیے قیام و طعام، لباس اور کتب کی فری سہولیات

فوری ضرورت اساتذہ

تجربہ کار، تحریکی اور نظریاتی اساتذہ (انگریزی، ریاضی، کمپیوٹر، عربی درس نظامی)۔ اپنی درخواستیں ہمراہ نقول اسناد و شناختی کارڈ ارسال فرمائیں۔

■ معقول مشاہرہ اور مراعات ■

اعلانِ داخلہ

درس نظامی/دورہ حدیث کے مکمل آٹھ سالہ کورس کے سال اول میں داخلہ جاری ہے

شرائط داخلہ

- داخلہ بذریعہ ٹیسٹ ہوگا
- درجہ مڈل کا امتحان پاس کیا ہوا ہو
- عمر ۱۵ سال سے زائد نہ ہو
- قرآن پاک ناظرہ پڑھا ہوا ہو
- حافظِ قرآن کو ترجیح دی جائے گی

ڈاکٹر محمد اقبال رئیس الجامعہ فون: 0693-63362 رہائش: 0693-62219 مولانا فصیح اللہ مدنی، فاضل مدینہ یونیورسٹی

کتاب نما

فتنہ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، پروفیسر افتخار احمد بلخی۔ ناشر: کفایت اکیڈمی، شاہراہِ لیاقت، نزد فریر مارکیٹ، کراچی۔ صفحات: حصہ اول: ۲۰۸، حصہ دوم: ۴۰۳، حصہ سوم: ۵۸۶ قیمت: اول: ۱۲۵ روپے، دوم: ۲۱۰ روپے سوم: ۲۶۵ روپے۔

فتنہ انکارِ حدیث پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بظاہر خردمندی کے علم بردار یہ حضرات اپنے باطن میں رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے انکار کا ناسور پالے ہوئے ہیں۔

اب سے تقریباً پچاس برس پہلے، نوتشکیل شدہ ریاست پاکستان میں منکرین حدیث نے باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ ان کا اصل مقصد تحریک احیاے اسلام کا راستہ روکنا تھا۔ اگرچہ اس فتنے کی تاریخ قدیم ہے، لیکن عصرِ حاضر میں اس کا بڑا سبب مطالبہ نظامِ اسلامی ہی بنا۔ شعبہ معارف اسلامیہ، کراچی یونی ورسٹی کے سابق صدر پروفیسر افتخار احمد بلخی [م: ۱۹۷۴ء] بلند پایہ عالم دین، معروف استاد، انفرادیت کے حامل محقق اور علومِ اسلامیہ بالخصوص ذخیرۂ حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے منکرین حدیث کا ہر قابلِ ذکر اقدام نوٹ کیا، ہر گھات پر نظر رکھی اور ہر اعتراض کو اصل مآخذ کی بنیاد پر مدلل انداز سے رد کیا۔

بلخی مرحوم نے غلام احمد پرویز [م: ۱۹۸۵ء] کے ہاں ترجمے کی غلطیوں، عربی سے ناواقفیت اور فہم دین و منصبِ رسالتؐ سے بے خبری کو بے نقاب کرنے کے ساتھ مولانا مودودی کے دفاع کا بھی حق ادا کیا ہے۔ دفاع ان معنوں میں کہ منکرینِ حدیث نے دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے لیے حدیث کے استہزا اور مولانا مودودی کے رد کے لیے بیک وقت اور بیک زبان جو مہم چلائی تھی، یہ کتاب اس دوطرفہ حملے کا بھرپور جواب ہے۔ یہ کتاب نہ صرف حجیتِ حدیث کے استدلالی سرمائے سے مالا مال ہے بلکہ مولانا مودودی کے دفاع کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے۔

اس طرح مصنف نے دفاعِ دین کے جذبے سے اور اپنے وسیع مطالعے کی مدد سے انکارِ حدیث کی معاصر سرگرمیوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ (سلیم منصور خالد)

اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر۔ اہتمام: انسٹی ٹیوٹ آف اقبال اسٹڈیز، ناشر: کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور (مجلد مع اشاریہ)۔ صفحات: ۳۸۷۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

بعض افراد اپنے کام اور پیغام کے حوالے سے اپنے شخصی وجود سے نکل کر ایک تحریک، عہد یا رویے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ تاہم تاریخ میں ایسی شخصیات خال خال ہی ہوتی ہیں۔ علامہ محمد اقبال ایسی ہی ایک باکمال شخصیت تھے۔ شہرت، دولت اور قوت کی حامل شخصیات سے بعض اوقات افسانوی حکایتیں منسوب کر دی جاتی ہیں یا پھر اُن کو حاسدانہ اور رقیبانہ الزام تراشی کی آگ میں جلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ افسوس کہ اقبال کے ساتھ بھی بہت سے 'دانش وروں' نے یہی معاملہ کیا۔

اقبال نہ معصوم عن الخطا تھے اور نہ کوئی فوق البشر۔ غلطی اور کوتاہی کا صدور ہر کسی سے ممکن ہے لیکن اقبال شکنی کی گذشتہ ایک سو سالہ روایت میں اُن کے کرم فرماؤں نے اتہام والزام کی جو گولہ باری ان پر کی، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے دشمن اور حاسد، بڑے ہی چھوٹے لوگ تھے۔ مختلف اوقات میں وضع کیے جانے والے ایسے سترہ الزامات کی فہرست پروفیسر موصوف نے اس کتاب میں پیش کی ہے۔ مثال کے طور پر: طوائف کا قتل، شراب نوشی، معاشقے، سرکا خطاب، مسلم سامراجیت، بداعمالی، تضادفکر، وغیرہ وغیرہ۔

مصنف نے اس نوعیت کے الزامات کا پس منظر پیش کرتے ہوئے داخلی و خارجی شواہد کی بنیاد پر ہر الزام کا جواب پیش کیا ہے اور اپنی اس کاوش کو دستاویزی حوالوں سے مرصع کیا ہے۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا، جسے پیش کرنے کے لیے صبر ایوب کی صفت سے نسبت ضروری تھی۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے الزامات ''سنا تھا''، ''کیا ہوگا'' اور ''مشہور تھا'' جیسے اسلوبِ بیان کے رہینِ منت ہیں، جب کہ بعض چیزوں کو زندگی کے ارتقائی

جواز سے یکسر کاٹ کر اقبال کے مجموعی سراپے پر تھوپ دیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر الزام کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے الزام لگانے والے کا کمال تعاقب کیا ہے اور اس الزامی مہم کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کو ایک انسان' ایک شاعر اور ایک مسلمان کی حیثیت سے جانچا اور پرکھا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کو اپنے ''انقلابی'' شعور کے باوجود علامہ اقبال کا 'شاہین' ناپسند ہے کہ وہ بے چارے کبوتر کو شکار کرتا ہے۔ اس 'معصومانہ اعتراض' کے پس پردہ محرکات پر بھی بحث کی جاتی تو اچھا تھا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض لوگوں نے علامہ سے تمام تر عقیدت کے باوجود' بعض پہلوؤں سے اقبال سے علمی اختلاف کیا ہے' کیا ایسے حضرات (مثلاً سلیم احمد وغیرہ) کو اقبال مخالفین کے کیمپ میں دھکیل دینا مناسب ہے۔

سہیل عمر نے تقریظ میں بجا طور پر متوجہ کیا ہے کہ [ایوب صابر] اقبال دشمنی کے اس مخفی رویے کا بھی محاکمہ کریں جو علامہ کے چند نادان دوستوں کے ہاں نظر آتا ہے مثلاً: اقبال مجدد مطلق ہیں' اقبال تاریخِ انسانی کے عظیم ترین شاعر ہیں' اقبال دنیا کے سب سے بڑے مفکر ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تہمتیں زیادہ خطرناک ہیں جو امین زبیری ایسے لوگوں نے اقبال پر لگائی ہیں۔ (ص ۹)۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں ایک فکرانگیز اضافہ ہے۔ (س- م- خ)

Our First Book of Science' [سائنس کی پہلی کتاب] ڈاکٹر عبدالوحید چودھری۔ ناشر: دعوہ اکیڈمی' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' اسلام آباد۔ صفحات: ۱۰۷۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

سائنسی معلومات پر مبنی اس کتاب کو اسلامی نقطۂ نظر سے ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے' یعنی سائنس کو' جسے ایک لادینی علم سمجھا جاتا ہے' اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا خالق و مالکِ کائنات ہونا ثابت ہو۔ اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ایک انتہائی اہم اور ضروری کام ہے' لیکن سیکڑوں برس کی غفلت اور علمی تحقیق سے دُوری کے سبب آج ہمیں اسلامی تعلیمات سے جدید علوم کی مطابقت پیدا کرنے کا کام ایک کوہِ گراں معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس مقصد کے لیے ابتدائی سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں۔

زیرِنظر کتاب بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے لیکن شاید اتنی کامیاب نہیں ہے۔ کتاب میں

اگر چہ آیاتِ قرآنی کے حوالے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حمدیہ کلمات جابجا دیے گئے ہیں' تاہم مصنف سائنسی معلومات کو ایک جامع اور باضابطہ طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ غالباً انھیں سائنس پر مناسب عبور حاصل نہیں ہے جس کے سبب انھوں نے کئی باتیں خلافِ حقیقت بھی لکھ دی ہیں' مثلاً: یہ کہ ''خلا میں (بے وزنی کی کیفیت کے سبب) ہم ایک پورے خلائی جہاز (اور کسی بھی بڑی سے بڑی چیز) کو اپنی انگلی کے ذریعے اٹھا سکتے ہیں''۔ (ص ۱۹)۔ اسی طرح سائنس میں power (اردو: طاقت) ایک اصطلاح ہے جس کا ایک مخصوص اور معین مفہوم ہے مگر زیرنظر کتاب کے مصنف نے اس لفظ کو عمومی انداز میں جابجا اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کے معنی بالکل مبہم ہوجاتے ہیں' مثلاً: Power of Gravity' Power of Heat' Air Power' Power of Water' اور (water's) Power to Dissolve وغیرہ۔ پھر اسی لفظ کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا (He has power over every thing) سائنسی ہی نہیں' دینی نقطۂ نظر سے بھی نامناسب ہے' کیونکہ سائنسی اصطلاح power کا اطلاق محض مادی اجسام پر کیا جاسکتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے کوئی نسبت نہیں ہے جس کے لیے ''قدرت'' (Authority) کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

کتاب میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ اس کی پیش کش (layout) میں بھی نہ صرف خوب صورتی اور کشش نہیں ہے بلکہ اس معاملے میں خاصی غفلت اور تساہل سے کام لیا گیا ہے۔ خصوصاً صفحہ ۱۵ پر متن اور لے آؤٹ کی اغلاط کی بھرمار ہے۔

اگر یہ کتاب آزمایشی اور تجرباتی بنیادوں پر شائع کی گئی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ اسے دوبارہ شائع کرنے سے پہلے اس پر بھرپور اور ہمہ گیر نظرثانی کی جائے اور درج بالا گزارشات کو ملحوظ رکھا جائے۔ (فیضان اللہ خان)

مادرِ ملّت اور بلوچستان' ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ناشر: سیرت اکادمی بلوچستان (رجسٹرڈ)' سیٹلائٹ ٹاؤن' کوئٹہ۔ صفحات: ۱۲۷۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

۲۰۰۳ء کو محترمہ فاطمہ جناح کے سال کے طور پر منانے کا اعلان کیا گیا تو ان کی حیات و

خدمات کے حوالے سے متعدد کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کا موضوع صوبۂ بلوچستان کے حوالے سے محترمہ فاطمہ جناح کی یادوں اور خدمات کا احاطہ ہے۔ ایک حصّے میں محترمہ کی اُن سرگرمیوں (مختلف علاقوں کے دوروں' عوامی و سیاسی اجتماعات میں شرکت اور عوام سے خطاب) کی تفصیل فراہم کی گئی ہے جن کا تعلق صوبۂ بلوچستان سے ہے۔ دوسرے حصّے میں محترمہ فاطمہ جناح سے متعلق بلوچستان کے اہلِ قلم کے مضامین و منظومات شامل ہیں۔ اس کتاب کے خاص مشمولات درج ذیل ہیں:

۱- جولائی ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ میں خواتینِ بلوچستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی روداد اور تقریریں۔ اس اجلاس میں محترمہ فاطمہ جناح بھی شریک تھیں۔ مولف نے یہ تفصیلات ہفتہ وار الاسلام (کوئٹہ' خواتین نمبر) بابت ۷/رجب ۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء سے حاصل کی ہیں۔

۲- ''مادرِ ملت بلوچستان میں---قدم بہ قدم'' کی توقیت بھی اہم ہے۔

۳- بیرسٹر یحییٰ بختیار اور قاضی محمد عیسیٰ سے محترمہ فاطمہ جناح کی مراسلت۔

کتاب کے مولف کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ وہ اس سے قبل کئی علمی و ادبی تصنیفات و تالیفات اُردو دنیا کو دے چکے ہیں۔ تازہ کتاب بھی ان کے معیارِ قلم کی روایت کا حصّہ سمجھی جانی چاہیے۔(رفاقت علی شاہد)

اسلام' انٹرنیٹ پر' محمد متین خالد۔ ناشر: علم و عرفان پبلشرز' ۳۴- اُردو بازار لاہور۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

انٹرنیٹ دورِ جدید کی انتہائی اہم دریافت و ایجاد ہے۔ اس نے فاصلے ختم کر دیے ہیں اور رابطوں کے اخراجات میں بھی غیر معمولی کمی کر دی ہے۔ مذکورہ کتاب میں انٹرنیٹ کے بارے میں تعارفی مضامین کے علاوہ درجنوں سائٹس کا سرسری تعارف بھی شامل ہے جو اسلام' اسلامی تعلیمات' قرآن' حدیث' فقہ' تاریخ' مسلم دنیا اور مسلمانوں کے وسائل وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

ایک طرف تو انٹرنیٹ کے ذریعے انارکی' خلفشار اور فحاشی کو پھیلانے کا کام وسیع پیمانے

پر ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی سائٹس کا قیام خوش آیند ہے جو اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے قائم ہوئی ہیں، متین خالد نے محنت شاقہ کے بعد اہم سائٹس کے کوائف اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔ ایسی سائٹس بھی موجود ہیں جہاں سے آپ قرآن پاک اٹھارہ زبانوں میں حاصل (ڈاؤن لوڈ) کر سکتے ہیں، اسی طرح اسلامی تاریخ کے تمام واقعات کی تفصیلات جان سکتے ہیں، روزمرہ مسائل کا شرعی حل جان سکتے ہیں اور کعبۃ اللہ اور مسجد نبویؐ کی اذان سن سکتے ہیں وغیرہ۔

اس کتاب کا ایک اور قابلِ تعریف پہلو یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنی حد تک قادیانیوں کی اور یہودیوں کی سائٹس کے پتے بھی دیے ہیں تاکہ ایسی اسلام دشمن طاقتوں سے آگاہی ہو سکے۔ موجودہ دور کی ضروریات کے اعتبار سے یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ (محمد ایوب منیر)

ربا کیس: حکومتی وکلا کے دلائل کا جواب، سید معروف شاہ شیرازی۔ ناشر: منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

آئینِ پاکستان میں متفقہ طور پر قرآن و سنت کو سپریم لا قرار دیا گیا ہے لیکن اقتدار کی راہداریوں میں براجمان بیوروکریسی، اس آئین کی جس طرح بے حُرمتی کرتی چلی آرہی ہے اس کی ایک جھلک فاضل مصنف نے زیرنظر کتاب میں دکھائی ہے۔

جون ۲۰۰۲ء میں سپریم کورٹ نے ربا کیس کی سماعت کی۔ اس موقع پر سودی نظام کے حق میں حکومتی وکیل کاظم رضا اور یونائیٹڈ بنک کے وکیل راجا اکرم نے دلائل دیے۔ مصنف نے ان دلائل پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ قرآن و سنت سے متصادم ہیں اور اس معاملے میں حکومتی بدنیتی واضح ہوتی ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ دنیا بھر میں سود سے نجات کے لیے کوشش اور تجربے ہو رہے ہیں، مثلاً: جاپان نے سود زیرو کے قریب کر دیا ہے اور دوسرے ممالک کو صنعت کے لیے ایک فی صد یا اعشاریہ ۵ فی صد پر قرض دے رہا ہے (ص ۴۷)۔ سوڈان میں جاری اسلامی بنک کاری، پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں اور پاکستان کے تجویز کردہ ماڈل پر مبنی ہے (ص ۸۱)۔ اس طرح بعض دیگر اسلامی ممالک (بنگلہ دیش وغیرہ) میں بھی

کامیابی کے ساتھ بلاسود بنک کاری ہو رہی ہے۔

مذکورہ کتاب کے باب ششم میں فاضل مصنف نے ترقی پذیر ممالک پر امریکہ، ورلڈ بنک، آئی ایم ایف، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مار دھاڑ اور نام نہاد مسلمان حکمرانوں کی بے حمیتی کے نمونے جمع کیے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس موضوع پر یہ ایک عمدہ اور مفید و معاون کتاب ہے۔ البتہ پروف خوانی مزید توجہ سے ہونی چاہیے۔ (عبدالجبار بھٹی)

نیل کا مسافر (ناول) اختر حسین عزمی۔ ناشر: اذانِ سحر پبلی کیشنز، ۴۲- چیمبرلین روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۵۹۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

اخوان المسلمون کے بانی اور مرشدعام سید حسن البنأ شہید کی داستانِ عزیمت کو ناول کے دل چسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی اس کاوش میں ادبی اور تحریکی دونوں تقاضوں کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول سے سید حسن البنأ کی ابتدائی زندگی، تعلیمی کارناموں، سماجی خدمات، دعوتی سرگرمیوں، اس دور میں مصر کے سیاسی حالات، اخوان المسلمون کے قیام، اسے درپیش اندرونی اور بیرونی خطرات اور قید خانوں میں ڈھائی جانے والی صعوبتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ حسن البنا شہید کو کس طرح شہید کیا گیا۔ اسی طرح اصلاحِ احوال اور غلبۂ دین کے لیے اخوان المسلمون کے قائد کی فکرمندی، فرقہ بندی کے خلاف چارہ جوئی، تزکیہ نفس پر زور، حکیمانہ دعوتی اسلوب، لذتِ تقریر اور مدلل اندازِ گفتگو سمیت ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مصنف کا اصلاحی اسلوب پورے ناول پر محیط ہے۔ ناول سادہ اور بیانیہ نثر میں لکھا گیا ہے۔ ناول کی فنی باریکیوں سے قطع نظر، مصنف نئی نسل کے سامنے حسن البنا شہیدؒ کی شخصیت کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ (سلیم اللہ شاہ)

ڈاکٹر محمد حمیدؒ اللہ کی بہترین تحریریں، مرتب: سید قاسم محمود۔ ناشر: بیکن بکس، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۹۲۔ قیمت مجلد: ۲۷۵ روپے۔

ڈاکٹر حمیدؒ اللہ کے انتقال کے بعد اہلِ علم نے ان کی یاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ یقیناً یہ معاشرے کی زندگی کی علامت ہے۔ ایک طرف یادگاری مضامین کا سلسلہ شروع ہوا تو دوسری طرف کتب آنا شروع ہوگئیں۔ اس سلسلے کی زیرِنظر کتاب حسنِ ترتیب اور حسنِ طباعت کے لحاظ سے بڑی دل کش ہے۔ حسنِ تدوین کے لیے سید قاسم محمود کا نام ضمانت ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کے چند اہم مضامین سلیقے سے ترتیب دے کر جمع کر دیے گئے۔

کتاب میں ۱۲ خطبات بہاولپور کی تلخیص و تسہیل اور ۴۰ استفسارات کے جواب شامل ہیں۔ پہلے حصّے میں حمیداللہ مرحوم کی شخصیت پر چند مطبوعہ مضامین (محمود احمد غازی، صلاح الدین شہید، شاہ بلیغ الدین) ہیں۔ آخر میں ایک ہی صاحب کے نام ان کے مکتوبات ہیں جن پر وضاحتی نوٹ بھی دیے گئے ہیں۔ ان تین طرح کے آئینوں میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی شخصیت چلتی پھرتی دیکھی جاسکتی ہے اور ان کی وسعتِ نظر اور تبحرعلمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

غرض یہ کتاب ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے لیے نہایت موزوں اور قرار واقعی خراجِ عقیدت و تحسین ہے جس کا مطالعہ قاری کو ان کی زندگی اور کام کے ہر پہلو سے بلاواسطہ آگاہی دیتا ہے۔ کتاب کے نام میں ''بہترین'' کے بجائے ''منتخب'' زیادہ بہتر ہوتا۔ (مسلم سجاد)

تعارفِ کتب

☆ **نونہال**، خاص نمبر، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ناشر: دفتر ہمدرد نونہال، ڈاک خانہ ناظم آباد، کراچی-۷۴۶۰۰۔ صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۲۰ روپے۔ [نونہال، پچاس سال سے بچوں کا معیاری ادب پیش کر رہا ہے۔ یہ اس کا خاص نمبر ہے۔ دل چسپ اور سبق آموز مضامین، کہانیاں، نظمیں وغیرہ۔ بچوں کی ذہنی استعداد بڑھانے اور ان میں مثبت، تعمیری جذبات پیدا کرنے کی قابلِ قدر کاوش۔]

☆ **مسائل حج و عمرہ**، مولانا غلام محمد منصوری۔ پتا: مکتبہ برہان، اُردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۴۱۴۔ قیمت: درج نہیں۔ [اپنے موضوع پر مفید کتاب، مگر کتابت زیادہ جلی اور صفحات زیادہ ہیں۔ قدرے مختصر، کم ضخامت ہو تو افادیت کا دائرہ وسیع ہوگا۔]

مدیر کے نام

اعجاز علی ندیم ' لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن کی "اشاعتِ خاص" کا سرِورق دیکھا تو عجیب لگا کیونکہ معمول سے ہٹ کر تھا۔ مضامین کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ علم کے موتی ایک گلدستے کی صورت میں جمع ہوگئے ہیں' ان سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ خلیل الرحمٰن چشتی نے "تحریک احیاے دین کے قافلہ سالار" میں کمال اندازِ بیاں سے تاریخ کے پس منظر کے ساتھ مولانا کی خدمات کا ذکر بہت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک عام قاری کے لیے جو مولانا کی شخصیت کے بارے میں لاعلم ہو تصویر کا پورا رخ پیش کرتا ہے۔ یہ مضمون جہاں مولانا مودودیؒ کی علمی خدمات کا احاطہ کرتا ہے وہاں جماعت کی جدوجہد کو بھی تاریخی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ "یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند" پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مولانا بہت بڑے پائے کے قانون دان بھی تھے۔ "مودودی نمبر" سے ہمیں ایک صدی پر محیط مسلمانوں کی دینی' علمی و سیاسی خدمات اور احیاے اسلام کی جدوجہد سے آگہی ہوئی۔ مولاناؒ پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے کہ انھوں نے اس صدی میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کر کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

اعظم بیگ ' گجرات

"اشاعتِ خاص" کے مضامین کو اعلیٰ معیار کا پایا' تاہم ڈاکٹر جاوید اقبال کے خیالات' تجزیے اور اجماع امت سے متعلق مشورے سے دل آزاری ہوئی۔ سرورق سے کئی سوالات ذہن میں اٹھے۔ ہزاروں سالوں پر محیط فکر مودودیؒ سے شخصیت پرستی کا سوال بھی ذہن میں اٹھا اگرچہ پروفیسر خورشید احمد کے بقول یہ "احسان مندی اور محسن شناسی" ہے۔

سید شاہد ہاشمی ' کراچی

"اشاعتِ خاص" کے مطالعے سے قبل میں مولانا مودودیؒ کو بڑا آدمی سمجھتا تھا لیکن اسے پڑھ کر یقین ہوگیا کہ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ سید صاحب تو اس سے کہیں زیادہ' بہت زیادہ بڑے انسان تھے۔ انھیں قریب سے دیکھنے والوں کی تحریریں بتا رہی ہیں کہ وہ "عظمتِ کردار' وسعتِ ظرف' علوے ہمت' درویش مزاجی' اِتقا' توکل' تحمل' صداقت شعاری' ایثار' تدبر' دردمندی' ذہانت' فراست اور شگفتہ مزاجی" جیسی عمدہ' مسنون اور اب ناپید ہوتی

ہوئی خصوصیات کے حامل رہنما تھے۔ بیرونی تحریکی شخصیات کے مزید مضامین ہونے چاہییں۔ اگلے شمارے میں یہ کمی دُور ہو جائے تو بات بن جائے گی۔ مولانا محترم کی زندگی کے آخری چند ماہ' چند ہفتے' چندروز' روزِ وداع اور سفرِ وداع پر بھی معلومات اس تاریخی سلسلے کا حصہ بنایئے۔ اب تحریک کے ہم سفروں کی بڑی تعداد مولانا مرحوم سے زمانی طور پر بُعد کے سبب یہ جاننا چاہے گی۔ یہ معلومات بھی ان شاء اللہ مفید ہوں گی۔

غازی الدین' کراچی

''اشاعتِ خاص'' کے سرورق پر ایک صدی سے دوسری صدی اور پھر صدیوں سے ہوتے ہوئے ایک ہزاریے سے دوسرے ہزاریے کی طرف پیش رفت کی جس طرح مؤثر جدول بندی کی گئی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی' اور واقعی قابلِ ستایش ہے یہ منظرنامہ! اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ مولاناؒ کی فکروعمل جو ان کی تحریروں وتقریروں سے لے کر تشکیلِ جماعت اسلامی تک اور پھر ان کی منظم تحریک کا ربط عالمی اسلامی تحریکوں اور شخصیتوں و دیگر بین الاقوامی اداروں اور افراد سے عبارت ہے' اس کے اثرات وثمرات صرف ایک صدی تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ بے کنار ہو کر ہزاریوں میں منتقل ہوتے رہیں گے۔

احمد علی محمودی' حاصل پور

غزالیِ عصر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بلاشبہہ اس صدی کے عظیم انسان تھے۔ ان سے عقیدت ومحبت تو پہلے بھی تھی مگر اس اشاعتِ خاص نے مجھے اپنے مرشد کا مزید گرویدہ بنادیا ہے۔

ناصر قریشی' لاہور

''راوانڈا: ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی'' (دسمبر ۲۰۰۳ء) پڑھ کر دلی مسرت ہوئی کہ کس طرح راوانڈا کے مظلوم مسلمان صبر وضبط کا دامن تھامے' حالات کا جائزہ لیتے رہے' خانہ جنگی میں مبتلا دونوں دھڑوں کو بلاامتیاز مذہب وملت' پناہ اور تحفظ دیتے رہے اور اپنے اعلیٰ اخلاق وکردار سے دعوتِ اسلام دیتے رہے۔ اس کے اثر سے ہزاروں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کیا عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان کو مسلمان کرنے اور مسلمان ہونے والوں کے لیے اپنے فرائض کا احساس ہے!

☆ سربکف' سربلند پر تبصرے (دسمبر ۲۰۰۳ء) میں کتاب کی قیمت ۱۷۰ روپے لکھ دی گئی' جب کہ اصل قیمت ۷۰ روپے ہے۔

امن ومحبت کی بستی۔اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم وتحقیق



محورِ تعلیم وتحقیق

قرطبہ

مدینۃ العلم نے ملکی اور بین الاقوامی، مذہبی اور تہذیبی صورت حال کومحسوس کرتے ہوئے ایک مثالی اسلامی شہر، جوکہ اکیسویں صدی کے لیئے تعلیم وتحقیق کا محور ہوگا، بنانے اور آباد کرنے کا عظیم منصوبہ قرطبہ ترتیب دیا ہے۔اس منصوبہ کومعرضِ وجود میں لانے کے لیئے امیرِ جماعت اسلامی پاکستان محترم قاضی حسین احمد کی قیادت میں دنیائے اسلام کے مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور تکنیکی ماہرین کمربستہ ہیں۔

محلِ وقوع:

اسلام آباد جس کا شمار دنیا کے چند خوبصورت اور صاف ستھرے شہروں میں ہوتا ہے کی فضاؤں کو مجوزہ شہر قرطبہ کے لیئے منتخب کرتے ہوئے اسلام آباد سے تقریبا **50** کلومیٹر کے فاصلہ پر پاکستان موٹروے، چکری انٹرچینج سے ملحقہ خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں، کھلے اور پُرفضا ماحول میں وسیع وعریض اراضی خریدتے ہوئے عظیم منصوبے قرطبہ کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔

مجوزہ سہولیات:

انشاءاللہ قرطبہ اُن تمام جدید رہائشی سہولیات سے مزین ہوگا جوتکنیکی ماہرین اب تک مہیا کرسکے ہیں۔مثلا

★ آبادکاری کی صدسالہ منصوبہ بندی ★ بین السیکٹر شاہراہ، کشادہ سڑکیں فٹ پاتھ ★ بارشی پانی کے نکاس کانظام ★ پینے کے میٹھے پانی کی فراہمی کانظام ★ گندے پانی کوٹھکانے لگانے کا انتظام ★ بجلی کی فراہمی کا زمین دوز نظام ★ ٹیلی فون کا نظام
★ قدرتی گیس کی فراہمی کانظام ★ خریداری مراکز کی عمارات ★ معاشرتی مقاصد کے لیئے سوک سنٹر، خواتین وحضرات کے لیئے سکول کالجز اور پرائمری سکول، ہسپتال، سیکٹر مساجد کی عمارات ★ پولیس اسٹیشن، پوسٹ آفس، فائر بریگیڈ کی عمارات
★ قرطبہ کے اندر بس سٹاپ اور دوسرے شہروں کوآنے جانے والے راستوں پر بس شاپ
★ پیٹرول پمپ ★ شجرکاری اور پارک بنانے اور دیکھ بھال کانظام ★ حفاظتی دیوار اور سیکورٹی کا نظام ★ کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کا نظام ★ سٹریٹ لائیٹ کا نظام
★ مدینۃ العلم کے دفتر اور سہولیات کو چلانے اور دیکھ بھال کا دفتر اور ورکشاپ کی عمارات

رہائشی سہولیات کی دیکھ بھال کا نظام

قرطبہ میں فراہم کردہ تمام سہولیات کاانتظام وانصرام مدینۃ العلم کرے گی۔جس کے لیئے خصوصی ضابطہ تشکیل دیا جائے گا اور تمام رہائشی اُس کے پابند ہوں گے۔

خصوصی سہولیات:

★ قرطبہ کے لیئے اندرونی ٹرانسپورٹ کانظام ★ قرطبہ سے راولپنڈی اور اسلام آباد تک ٹرانسپورٹ کانظام ★ گھروں کی تعمیر کے لئے آرکیٹیکٹ کی خدمات اور ہر پلاٹ سائز کے لئے **50** نمونہ کے ڈیزائن کی فراہمی ★ بلوں کی ادائیگی اور شکایات کے ازالے کے لئے ون ونڈو اپریشن ★ قرطبہ کوتعمیر اور آبادی کے مرحلہ کے بعد بھی خوبصورت رکھنے کے لئے خصوصی تعمیراتی قوانین

امتیازی خصوصیات:

★ **بین الاقوامی یونیورسٹی:** بین الاقوامی یونیورسٹی اور تعلیمی مرکز کا قیام وانصرام
★ **جامع مسجد قرطبہ :** وسیع وعریض میدان سے ملحقہ جامع مسجد اور دینی وتہذیبی تحقیقی مرکز کا قیام وانصرام
★ تمام گھر یونیورسٹی اور دینی مرکز سے کیبل کے زریعہ منسلک
★ خواتین کے لئے خصوصی تجارتی مراکز کا قیام

قیمت پلاٹ:

27,000 کنال پر مشتمل عظیم الشان منصوبہ میں ترقیاتی اخراجات سمیت یکمشت ادائیگی / قسطوں پر پلاٹ حاصل کیجئے۔خواہشمند حضرات کے اصرار پر سابقہ اور نئے خریداروں کی سہولت کیلیئے ادائیگی اقساط کی مدت تین سال کردی گئی ہے۔پلاٹ کی قیمت میں کسی اضافے کے بغیر اقساط میں **33.3%** کی کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

بمعہ ترقیاتی اخراجات

پلاٹ سائز	قیمت پلاٹ	20% ادائیگی بکنگ	گیارہ سہ ماہی اقساط میں	آخری قسط
500 گز	500,000 روپے	100,000 روپے	33,400 روپے	32,600 روپے
250 گز	250,000 روپے	50,000 روپے	16,700 روپے	16,300 روپے
125 گز	125,000 روپے	25,000 روپے	8,350 روپے	8,150 روپے

یکمشت ادائیگی کی صورت میں قیمت پر **10** فیصد خصوصی رعایت دی جائے گی۔

طریقہ کار:

★ درخواست فارم جوکہ بمعہ بروشر معلومات درج زیل دفاتر ودفاتر جماعت اسلامی سے حاصل کیا جاسکتا ہے، کے ہمراہ شناختی کارڈ کی فوٹوکاپی اور تین پاسپورٹ سائز تصاویر لگائیں اور چیک / ڈرافٹ (بنام مدینۃ العلم) کے ساتھ ہمارے پتہ پر ارسال فرمائیں(ڈرافٹ کے پیچھے مکمل نام وپتہ ضرور درج کیجئے)۔
★ ادائیگی کی سہولت پاکستان میں بینک الفلاح لمیٹڈ کی تمام برانچوں میں موجود ہے۔

برائے پاکستانی روپے **(Pak Rs.)** اکاؤنٹ نمبر: **01135017**

برائے ڈالر **(U.S. $)** اکاؤنٹ نمبر: **01801194**

مدینۃ العلم

(کمپنیز آرڈیننس **1984** دفعہ **42** کے تحت رجسٹرڈ)

لاہور (ہیڈ آفس)

منصورہ ملتان روڈ لاہور، پاکستان

فون: **5419520-4, 5432391-5** فیکس **92-42-5432194**

URL:http://www.jamaat.org E-MailL Amir@ji.org.pk

اسلام آباد (پروجیکٹ آفس)

فلیٹ نمبر **4** فرسٹ فلور، خیبر پلازہ فضل حق روڈ بلیو ایریا اسلام آباد۔

فون نمبر **92-51-2206380, 2274563** فیکس: **92-51-2270411**

تکنیکی تجاویز: **QurtabaCity@hotmail.com**

L.R.L 99 Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE. Ph: 7587916 Fax: 7585590